معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپیے — فی شمارہ پانچ روپیے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا —— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۴۹ ماہ شعبان المعظم ۱۴۱۲ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۹۲ء عدد ۲

مضامین

ضروری اعلان

ہر قسم کا چیک، ڈرافٹ اور منی آرڈر صرف دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کے نام سے آنا چاہئے
جس مہینے کا پرچہ نہ ملے اس کی اطلاع دوسرے مہینے کے شروع میں ضرور کردی جائے
ورنہ تعمیل ممکن نہ ہوگی۔

"منیجر"

شذرات

ہندوستان کے دورِ محکومی میں تاریخ سیاسی مصلحتوں کے ماتحت مسخ کی جاتی رہی ہے، انگریزوں نے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی تاریخ ہند کی کتابوں میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی باتیں جمع کی تھیں جن سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات میں نفرت و اشتعال پیدا ہو اور اختلاف و افتراق کی خلیج کم نہ ہونے پائے، اب گو ہندوستان کو انگریزوں کی سیاسی غلامی سے نجات مل گئی ہے لیکن ابھی تک یہاں کے لوگ نہ ان کی ذہنی غلامی سے آزاد ہوئے ہیں اور نہ ان کا درسِ انتشار بھولے ہیں، اس لیے اب بھی تاریخ کو تفریقی سیاست کا آلۂ کار بنایا جا رہا ہے اور یہ دکھایا جا رہا ہے کہ ہندوستان کی ان دونوں قوموں میں میل ملاپ کے بجائے ہمیشہ تصادم اور ٹکراؤ رہا، انگریزوں کے دور کی طرح آزاد ہندوستان کے مورخین بھی مسلمانوں کے مظالم کے فرضی قصے بیان کرکے دونوں قوموں میں نفرت و اشتعال بڑھا رہے ہیں۔

اسکول کے کم سن بچوں کے ذہنوں کو مسموم کرنے کیلئے اب جو کتابیں داخل درس ہیں ان میں ہندوؤں پر مسلمان حکمرانوں کے ظلم و زیادتی کے فرضی واقعات درج ہیں، راجستھان کے ایک خط سے معلوم ہوا کہ وہاں کے ہر ضلع میں درجہ ہفتم میں مسلم عہد حکومت کی تاریخ پڑھائی جاتی ہے، کئی سال سے اورنگ زیب سے متعلق Objective type Paper میں یہ مسموم سوال دُہرایا جاتا ہے کہ "ہندوؤں پر انیک اتیاچار کرنے والا مغل سمراٹ تھا" مکتوب نگار نے اس کی چار عدد فوٹو کاپی بھی بھیجی ہے، ضلع انسپکٹر اور ڈائرکٹر آف ایجوکیشن راجستھان سے احتجاج کرنے پر کبھی وقفہ دے دیا جاتا ہے، اس سال پرچہ بنانے والی کمیٹی کے پرنسپل سے ملاقات کی گئی تو ششماہی امتحان میں بیک جنبش قلم تین شہنشاہوں کو نشانہ بنا دیا، سوال نمبر ا "ہندوؤں کے ساتھ اُدار نیتی اپنانے والا مغل سمراٹ تھا (الف) بابر۔ (ب) ہمایوں۔ (س) اکبر۔ (د) جہانگیر۔ ظاہر ہے اس سے صرف ہندو طلبہ کے ذہن ہی مسموم نہیں ہوں گے بلکہ سادہ اور خالی الذہن مسلمان بچوں کے دلوں میں بھی مسلم فرمانرواؤں سے نفرت اور گھن پیدا ہوگی۔

بلاشبہ مغل حکمراں معصوم نہیں تھے لیکن انھوں نے ملک کی عظمت میں چار چاند بھی لگائے ہیں اور بلاتفریق مذہب و ملت اس کے تمام باشندوں کے ساتھ عمدہ سلوک بھی کیا ہے، سر جادوناتھ سرکار سے لیکر اب تک کے اکثر مورخین اورنگ زیب کو ہندو کش، ظالم اور ستمگر کہے چلے جا رہے ہیں، لیکن کیا اس کی کتاب زندگی کے صفحات محبت، انصاف، رواداری، فراخ دلی اور حب الوطنی کے واقعات سے معرا ہیں، کیا اس کے متعدد فرامین میں بنارس کے مندروں اور پانڈوؤں کے مصارف کے لیے جاگیریں عطا کیے جانے کا ذکر نہیں ہے؟ لیکن تاریخ کی کتابوں میں ان کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے، دراصل اس ملک کی تاریخ میں ایسے واقعات کی کمی نہیں ہے جن کے پڑھنے سے دونوں قوموں کے درمیان اختلاط و محبت کے جذبات پرورش پائیں اور منافرت کے بجائے یکجہتی اور اتحاد کی تخم ریزی ہو، لیکن جب نیتیں صاف نہ ہوں تو ان پر نظر کیسے پڑ سکتی ہے؟ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا یہ ارشاد آج بھی بہت معنی خیز ہے "ہندوستان کو آگے چلنا ہے تو پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں چاہیے، اس بحث سے کہ سلطان محمود کا حملہ ہندوستان پر جائز تھا یا ناجائز اور شہاب الدین غوری نے کتنے مندر غارت کیے اور عالمگیر نے ہندوؤں پر کیا کیا ظلم کیے، ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا"۔

روس سے اشتراکیت کا خاتمہ ہو چکا ہے مگر ہندوستان کے اردو ادیب و شاعر ابھی تک اس کا گن گا رہے ہیں اور مارکس و لینن کے خیالات کی ترجمانی کر رہے ہیں، الحاد و بے دینی کا پرچار ان کا شیوہ بنا ہوا ہے، اسی قسم کے ادیب "اردو والے" کہلاتے ہیں، اردو کے ان اجارہ داروں میں یونیورسٹیوں اور کالجوں کے شعبۂ اردو کے اساتذہ اور سرکاری امداد سے چلنے والے اردو اداروں سے وابستہ افراد بھی شامل ہیں، اس بنا پر اردو کا ہر اعزاز انہی کو ملتا ہے اور یہی اس کے نام پر حاصل ہونے والی فتوحات و غنائم سے بھی متمتع ہوتے ہیں، ان کے حلقوں سے باہر کے اردو کے کسی بڑے سے بڑے مصنف کو اعزاز و انعام دیا جانا انھیں بہت گراں گذرتا ہے کیونکہ ان کے خیال میں وہ "اردو والا" نہیں ہے۔

اردو کے جن اداروں نے اردو میں علمی و تحقیقی تصنیفات کا انبار لگایا ہے اور مختلف علوم و فنون کی کتابوں سے اس کے ذخیرہ کو مالا مال کیا ہے، بلکہ بعض مصنفین نے نہ تنہا مذہب، فلسفہ، کلام، تصوف، ادب اور تاریخ و سیر پر مفید اور بلند پایہ کتابیں لکھی ہیں جو کسی زبان کیلئے بھی مایۂ فخر ہو سکتی ہیں، اور جن کے ملک و بیرون ملک کی مختلف زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے ہیں، اس موقع پر بے اختیار ہماری زبان پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا نام آگیا، وہ عربی کے علاوہ اردو کے بھی مشہور اہل قلم اور اچھے انشا پرداز ہیں اور جنھوں نے اپنے والد بزرگوار کی مقبول تصنیف "گل رعنا"

پر ادبی، تنقیدی اور تحقیقی حیثیت سے بلند پایہ مقدمہ لکھا ہے، ان کی سرپرستی میں "رابطہ ادب اسلامی" کے نام سے ایک ادبی تحریک بھی جاری ہے جس کے سمینار ہر سال پابندی سے کسی بڑے شہر میں ہوتے ہیں، اس کے باوجود "اردو والوں" میں ان کا شمار نہیں، یاللعجب!

"اردو والے" بقول خود وہ ہیں جو نظمیں، غزلیں، افسانے، ڈرامے اور ناول لکھتے ہیں اور ان کے ادبی و تنقیدی مضامین کے دو چار مجموعے چھپے ہیں یا جنھوں نے بعض متون کو ایڈٹ کیا ہے، حالانکہ اردو کے ان اجارہ داروں کو اس کے فروغ و ترقی کے بجائے صرف اپنے اعزاز و انعام سے سروکار ہوتا ہے، آج اردو غریب پر جو سخت اور نازک وقت آیا ہے، اس کے ذمہ دار بڑی حد تک اس کے "یہی کرم فرما" ہیں، ہم نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اردو اس ملک میں "اردو والوں" کے بجائے عربی مدارس، اردو کے غیر سرکاری اداروں اور ان ارباب قلم کی بدولت زندہ ہے جو نام و نمود، صلہ و ستایش اور فتوحات و غنائم سے بے پروا ہو کر خاموشی سے اردو کی خدمت و اشاعت میں لگے ہوئے ہیں۔

افسوس ۲ر فروری کو دارالمصنفین کے مخلص اور قدیم کارکن منشی عطاء اللہ صاحب نے داعی اجل کو لبیک کہا، ان کا اصلی وطن کیرانہ ضلع مظفر نگر تھا، ۱۹۱۶ء میں دارالمصنفین میں پریس قائم ہوا تو ان کے بڑے بھائی منشی عبدالحفیظ صاحب مرحوم نے اس کے انصرام کی ذمہ داری قبول کی، ان ہی کے ساتھ یہ بھی اعظم گڈھ آکر شعبۂ طباعت سے وابستہ ہوئے، جب کبر سنی کی وجہ سے ملازمت ترک کرنی چاہی تو سید صباح الدین صاحب مرحوم کا شدید اصرار اس میں مانع ہوا، پھر اپنے سعادت مند فرزند ڈاکٹر محمد نعیم ندوی کے اصرار سے گھر پر آرام کرنا منظور تو کر لیا لیکن ان کا دل دارالمصنفین ہی میں لگا رہتا تھا، اس لیے جب تک قوت رہی برابر دوسرے تیسرے روز یہاں آتے رہے، وہ طبعاً نیک، صلح پسند اور دیندار تھے، اپنی دینداری کی وجہ سے اپنے اکلوتے بیٹے ڈاکٹر محمد نعیم ندوی کو حفظ کرانے کے بعد ندوہ میں داخل کیا جو فراغت کے بعد دارالمصنفین کے رفیق رہے اور اب ابو ظبی کے محکمۂ شرعیہ سے وابستہ ہیں، منشی عطاء اللہ صاحب اپنی نیکی، بھلمنساہت اور ملنساری کی وجہ سے شہر میں بھی مقبول تھے، اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

مقالات

عہدِ غالب کا فکری اور تہذیبی ماحول[1]

از
پروفیسر خلیق احمد نظامی

غالب نے جب آنکھ کھولی تو سلطنت مغلیہ کا آفتاب اقبال گہن میں آچکا تھا، صدیوں کا سیاسی اور تہذیبی ماحول تیزی کے ساتھ رنگ بدل رہا تھا۔ اقبال نے ۱۷۹۹ء کو دنیائے اسلام میں تغیر احوال اور زوال و انحطاط کا سال قرار دیا ہے۔ ایک طرف ٹیپو سلطان کے خاتمہ نے مشرق میں تجدید و احیاء کی آخری امید پر پانی پھیر دیا تھا، تو دوسری طرف مغرب میں جنگ نوارینو (Navarino) میں ترکی بیڑے کی شکست نے مسلمانوں کی طاقت کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ اس کے بعد ہر طرف زوال و ادبار کے بادل منڈلانے لگے۔ غالب نے جب ہوش سنبھالا تو شاہجہاں کی دلی کہیں دور تاریخ کے دھندلکوں میں غائب ہو چکی تھی۔ لال قلعہ اب بھی وہیں تھا جہاں شاہجہاں نے بنایا تھا، دربار عام اور دربار خاص اب بھی منعقد ہوتے تھے لیکن ان کی حیثیت بازیچۂ اطفال سے زیادہ نہ تھی۔ بایں ہمہ ذہن اب تک یاد ماضی سے آزاد نہ ہوئے تھے۔ ایک بار غالب کی زبان سے بے اختیار نکل گیا ؎

درتہ این شہر زوال باز آمد می شناسم کہ مگر شاہجہاں باز آمد

---

[1] معارف۔ یہ فاضلانہ مقالہ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے بین الاقوامی غالب سمینار میں ۲۱ر دسمبر ۱۹۹۱ء کو پیش کیا گیا اور اب اسے معارف کی زینت بنایا جا رہا ہے۔

یہ دل کی خاموش تمنائیں تھیں جن کے پیچھے دلی کی یادِ ماضی کروٹیں لے رہی تھی۔ لیکن یہ خواب اب شرمندۂ تعبیر ہونے والے نہ تھے۔ تاریخ اپنا ورق الٹ چکی تھی۔ نئی دنیا عالم وجود میں آرہی تھی۔ یہ تبدیلی صرف ایک شاہی خاندان کی نہ تھی بلکہ ایک پوری تہذیب کا دم واپسیں تھا۔ نئے نظام کے پیچھے یورپ کا صنعتی انقلاب تھا، تجارت کی منڈیاں تھیں، تاجروں کے قافلے تھے اور تسخیر اقوام کے نئے جال تھے۔ تہذیبی قدریں، فکر و نظر کے سانچے، خوب و زشت کے پیمانے اپنے محور بدل رہے تھے۔ غالب کے بیقرار دل نے دعا مانگی ؎

بایدکہ جہانے دگر ایجاد شود تا کلبۂ ویران من آباد شود

یہ وہی کیفیت تھی جس کے متعلق ایک انگریز شاعر نے کہا ہے :

Wandering between two worlds, one dead

The other Powerless to be born.

غالب کے لیے نہ ماضی سے رشتہ توڑنا آسان تھا، نہ حال کی حقیقتوں کو نظر انداز کرنا ممکن۔ ان کی ذہنی کیفیت حالات کے اس تضاد کی پوری طرح عکاسی کرتی ہے۔ جب اپنے عہد کا یہ سب سے بڑا شاعر غم روزگار کا بوجھ اپنے سر پر لیے کلکتہ کی طرف قدم اس طرح اٹھاتا ہے کہ

چہرہ اندودہ بہ گرد و مژہ آغشتہ بہ خون خود گواہم کہ ز دہلی بہ چہ عنوان رفتم

تو غم دل کے ٹانکے ٹوٹتے نظر آتے ہیں۔ لیکن جب کلکتہ پہونچتے ہیں تو وقت اور مصلحت ان کے انداز تکلم کو بدل دیتے ہیں اور وہ کلکتہ کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ بقول مولانا آزاد :

"مرزا غالب کے بہت سے رجحانات و میلانات کی طرح یہ تاثر بھی ایک خاص جذبہ کا نتیجہ

تھا" (نقش آزاد، ص ۲۷۵)

غالب نے جگہ جگہ آزمائش کا ذکر کیا ہے۔

ع جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

یا

ع نئے فتنوں میں اب چرخ کہن کی آزمائش ہے

یہ آزمائشیں سیاسی اور تمدنی حالات کی پیدا کی ہوئی تھیں جن سے ان کو نبرد آزما ہونا پڑ رہا تھا۔ انھوں نے اس دور میں اپنی ذہنی کشمکش کو پورے شاعرانہ اعجاز کے ساتھ ایک دلکش تصویر کے سہارے اس طرح پیش کر دیا ہے ؎

بہ چوں عکس پل بسیلِ بذوق بلا برقص جا را نگاہ دار و ہم از خود جدا برقص

دریا کے امنڈتے ہوئے طوفان میں پل کا عکس جس طرح رقص کرتا نظر آتا ہے طوفان میں زندہ رہنے کا طریقہ بھی یہی ہے۔ عکس پل کی طرح رقص کرتے رہو لیکن اپنی جگہ نہ چھوڑو۔ اس شعر میں غالب نے اپنی ساری نفسیاتی کیفیت کو جس میں بے چارگی اور بے بسی کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیبی قدروں کو سینے سے لگائے رکھنے کا جذبہ بھی پوشیدہ ہے، ایک متحرک پیکر کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔ حیات غالب کا جتنا مطالعہ کیجیے یہی شعر چشم تصور میں انکی زندگی کا ترجمان بن کر بار بار ابھرے گا۔ اگر مشاہدہ حق کی گفتگو، بادہ و ساغر کہے بغیر نہ بنتی تھی، تو غم روزگار کی کیفیت بھی تشبیہہ و استعارہ کے بغیر بیان کرنا آسان نہ تھا۔

عصر حاضر کے مشہور مورخ اور دیدہ ور ماہر عمرانیات ارنلڈ ٹائن بی (Arnold Toynbee) نے لکھا ہے کہ جب ایک تہذیب شکست کھا کر دوسری تہذیب کے لیے جگہ چھوڑنے پر مجبور ہو جاتی ہے تو Schism of The soul روح کا انتشار پیدا

ہوجاتا ہے اور افکار و احساسات کی پوری دنیا کو متزلزل کر دیتا ہے۔ ادب، آرٹ، کلچر غرض زندگی کا کوئی شعبہ اس کے اثر سے نہیں بچتا۔ پھر challenge اور Response کا فطری عمل تیز تر ہو کر نئے ماحول سے مفاہمت کو کبھی آسان اور کبھی مشکل بنا دیتا ہے۔ بالآخر پرانی تہذیب وقت کے تقاضوں کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے۔ ایسے وقت میں ایک لمحہ کی غفلت منزل سے صدیوں کی دوری پیدا کر دیتی ہے۔ غالب نے سماجی انقلاب کے اس تہذیبی بحران سے یہ کہہ کر گزرنے کی کوشش کی ع

آرزو سے ہے شکست آرزو مطلب مجھے

لیکن حقیقت نے دامن دل پکڑ لیا اور ان کو یہ اعتراف کرنا پڑا

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

کعبہ و کلیسا کا ٹکراؤ یہاں شاعرانہ علامتیں نہیں، بلکہ زندگی کی زبردست حقیقتیں ہیں جن سے غالب کو دوچار ہونا پڑا تھا۔ سماجی تبدیلی کے اس ہوش ربا دور میں جذبات کے یہ تغیرات بالکل فطری Response کے آئینہ دار ہیں۔ تحیر، تجسس، احساس، و یقین کی کیفیات پیکر بدل بدل کر ان کے کلام میں ظاہر ہوتی ہیں اور دعوت فکر دیتی ہیں۔

غالب کے افکار و اعمال کے تجزیہ کے لیے ان کے ماحول پر نظر ہونی ضروری ہے۔ اسی کی مدد سے ان کے عمل اور رد عمل کی حقیقی نوعیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ غالب کی عمر ۲ سال تھی جب سرنگاپٹم میں ٹیپو سلطان نے غیر ملکی اقتدار کے خلاف جنگ کرتے ہوئے جان دی۔ اسی زمانہ میں چراغ علی شاہ اور ان کے ساتھیوں نے ترائی میں انگریزوں کے کارخانوں پر حملے شروع کیے۔ غالب ۳۵ سال کے تھے جب سید احمد شہیدؒ نے بالاکوٹ کے میدان میں شہادت پائی۔ اسی سال بنگال میں نرکل بریا کے میدان میں فرائضی تحریک کے مشہور رہنما تیتو میاں

نے انگریزوں کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دی۔ غالب کی عمر ۶۰ سال سے اوپر تھی جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ رستاخیز برپا ہوا۔ ممکن نہیں کہ وہ جنگ آزادی کے ان معرکوں سے، جو ہندوستان کے تین اہم مقامات، سرنگاپٹم، بالاکوٹ اور نرکل بریا سے تعلق رکھتے ہیں، ناواقف رہے ہوں۔ لیکن ان کا رد عمل صرف ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے متعلق ملتا ہے۔ پہلے تین حوادث میں سے کسی کا ذکر ان کی زبان پر نہیں آتا۔ ان سے پیدا شدہ اثرات کو ان کے کلام میں تلاش کرنے کے لیے نفسیاتی پیمانوں کی مدد درکار ہوگی۔ دلی ہندوستان کا قلب و جگر تھی، جہاں شمال و جنوب ہر طرف کی آواز سنائی دیتی تھی۔ انھوں نے ان سب ہنگاموں کے متعلق ضرور سنا ہوگا لیکن مصلحت اندیشی نے ان کی زبان پر مہر سکوت لگا دی۔ وہ ۱۸۵۷ء کے حوادث کا ذکر ضرور کرتے ہیں لیکن ان کے دل و دماغ کی کشمکش عجیب عجیب پہلو بدلتی نظر آتی ہے۔ مکتوبات میں ان کا دل تحیر و تفکر کے عالم میں آہیں بھرتا ہے۔ دستنبو میں ان کا دماغ تسلی دیتا اور تبدیلیوں کو قبول کرنے کی تلقین کرتا نظر آتا ہے۔ مصلحت اندیشی زخم دل کو چھپانے پر مجبور کرتی ہے۔ غم فردا، غم امروز پر غالب آجاتی ہے۔ معلوم نہیں انھوں نے اپنی غزلوں میں محشرستان بے قراری، دل و مژگان کا مقدمہ، کشاکش ہستی، پندار کا صنم کدہ کہہ کر اپنے کتنے جذبات پر پردے ڈالے ہیں۔ یہ سارے ہنگامے جن کو وہ غم عشق کی داستان بنا کر پیش کرتے ہیں، حقیقت میں یہ سب فکری اور تہذیبی زندگی کے معرکے تھے جن سے ان کو دوچار ہونا پڑا تھا۔

مشرق میں یورپ کے اقتدار و تسلط نے بے شمار تہذیبی، فکری اور سماجی مسائل پیدا کر دیے تھے۔ ان کو سمجھنا اور پستی و ادبار سے نکالنے کی راہ اور وسائل کی تلاش کرنا وقت کا سب سے اہم تقاضا تھا۔ ہندوستان، مصر، ترکی، ایران اور تیونس کے داعیان اصلاح

نے ان حالات میں مختلف طریقے اختیار کیے تھے، مولانا ابوالکلام آزاد نے ان تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے جمعیۃ العلما کے ایک خطبہ صدارت (۲۱ نومبر ۱۹۲۱ء) میں کہا تھا:

"مسلمانوں کو موجودہ پستی اور ادبار سے نکالنے اور ان کے عز و اقبال رفتہ کے واپس لانے کے لیے کیا اسباب و وسائل اختیار کرنے چاہئیں اور راہ عمل و فوز کیا ہو سکتی ہے؟ اس بارے میں ابتدا سے تین مختلف مذاہب اصلاح ہیں جو ہندوستان، مصر، ترکی، ایران، تیونس اور بلاد ترکستان و قفقاز کے داعیانِ اصلاح نے اختیار کیے... جب یورپ کے تمدن کا ہوش ربا جلوہ اسلامی ممالک کے سامنے بے نقاب ہوا تو دو مختلف اثرات دو مختلف جماعتوں پر مرتب ہوئے۔ غالب جماعت نے تو اپنی غفلت اور جمود کی وجہ سے اس انقلاب و تغیر کی طرف نظر ہی نہ اٹھائی لیکن ایک جماعت ارباب بینش و خبر کی بھی تھی جس نے فوراً تغیر احوال محسوس کیا... لیکن مقابلہ و مقاومت کی جگہ تقلید و اطاعت کے جذبات اس میں پیدا ہو گئے۔ ہندوستان میں سر سید احمد خاں .... ترکی میں سلطان محمود خاں، مصر میں محمد علی پاشا، تیونس میں خیر الدین صاحب اقوام المسالک اور بیرم تیونسی صاحبِ صفوۃ الاخبار اسی گروہ میں محسوب ہیں۔..... دوسرا مذہب اصلاح سیاسی تھا .... ممالک اسلامیہ میں اس مذہب اصلاح کے سب سے بڑے داعی سید جمال الدین اسدآبادی اور ترکی میں مدحت پاشا تھے۔"

اس عالمی خاکے میں غالب مختلف اور متضاد انداز ہائے فکر کے ترجمان نظر آتے ہیں۔ کبھی تغیر کی طرف آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ کبھی تقلید کی راہ پر گامزن نظر آتے ہیں۔ کبھی نئے رجحانات و افکار کی مدح و ستایش میں رطب اللسان ہو جاتے ہیں۔

اس دور کے ہندوستان کے علمی اور مذہبی ماحول پر نظر ڈالی جائے تو ہر طریقہ فکر اور

ہر انداز اصلاح و عمل کے داعیان سرگرم عمل نظر آئیں گے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے گھرانے نے کھل کر مقابلہ و مقاومت کی راہ اختیار کی، جہاد اور دار الحرب کے فتوے دیے اور میدانِ عمل میں کود پڑے۔ شاہ غلام علیؒ کے گھرانے نے انگریزی ملازمت کو ناجائز قرار دیا اور سر سید کی نذر کو جو انھوں نے سرکاری ملازمت قبول کرنے کے بعد پیش کی تھی، قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شاہ عبد الغنی مہاجر مدنیؒ نے مفتی صدر الدین آزردہ کے بھیجے ہوئے روپیے اس لیے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ ان کی صدر الصدوری کی تنخواہ جائز نہیں سمجھتے تھے۔ شاہ احمد سعیدؒ نے جہاد کی کھلم کھلا تلقین کی اور جب حالات ناقابل برداشت ہوئے تو ہجرت کر کے حجاز چلے گئے، شاہ کلیم اللہ دہلویؒ کا خاندان بازار خانم میں رہتا تھا۔ اس علاقہ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے باعث اس طرح برباد کیا گیا کہ نشان تک باقی نہ رہا۔ خواجہ میر درد کے خاندان اور میاں نصیر الدین عرف کالے صاحب نے خاموشی اختیار کی۔ غالب کا یہ کہنا کہ وہ کالے کی قید سے نکل کر گورے کی قید میں آ گئے، مذاقیہ انداز میں ہو، لیکن ایک دردناک حقیقت کا اظہار تھا۔ مولانا مملوک العلی نے درس و تدریس کے ذریعہ اصلاح حال کی کوشش کی۔ اس عہد کے تمام علمی مراکز نے انکے سایہ میں پرورش پائی۔ مدرستہ العلوم علی گڑھ کے بانی سر سیدؒ، اور دار العلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسمؒ اور مظاہر العلوم سہارنپور کے علما و مدرسین ان ہی کے دامن تربیت سے وابستہ تھے۔ ان کے شاگردوں نے قدیم و جدید دونوں علوم کی طرف توجہ کی۔

دہلی سے باہر مشاہیر علما و مشائخ نے جن میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے کھل کر برطانوی اقتدار کا مقابلہ کیا اور جب حالات نے بے بس کر دیا تو مکہ معظمہ ہجرت کر گئے۔ ایک ایسے دور میں جب ہر ذی ہوش انسان اپنے مستقبل سے ناامید یا اسکے لیے متفکر تھا اور اپنے لیے راہ عمل کی تلاش کر رہا تھا، غالب کا معاملہ "گہہ گریم و گہہ خندم" کا

رہا۔ انھوں نے سلطنت مغلیہ کے زوال پر آنسو بھی بہائے لیکن چھپ کر، انھوں نے بہادر شاہ کے لیے سکہ کے شعر بھی لکھے لیکن ڈر کر، انھوں نے جیسا کہ خود نواب یوسف علی خاں والئ رام پور کو ایک فارسی خط میں لکھا تھا "بظاہر آشنا" و "بہ باطن بیگانہ" کا معاملہ رکھا لیکن انھوں نے ایک شاعر کی تیز نگاہی کے ساتھ یہ محسوس کر لیا تھا کہ وقت کا قافلہ آگے بڑھ گیا ہے، اب ماضی کی بازیافت ممکن نہیں، چنانچہ انھوں نے دبے پاؤں اپنے احاطۂ فکر سے نکل کر حالات سے مصالحت کر لی۔ جس وقت لفٹنٹ گورنر کے سامنے، ایسی حالت میں سماعت اور بینائی دونوں جواب دے چکے تھے، زرافشاں کاغذ پہ یہ شعر لکھوا کر پیش کیا کہ

رسم است کہ مالکان تحریر آزاد کنند بندۂ پیر

تو زندگی کا وہ تضاد جو مدت العمر سایہ کی طرح ان کے ساتھ رہا تھا اور باوجود کوشش ان کا پیچھا نہ چھوڑتا تھا، بالکل ختم ہو گیا۔ لیکن اس تضاد سے کشمکش نے ان کی روح کو گھلا دیا۔ کہنے لگے ع

رشک آسایش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

غلام غوث بے خبر نے کیفیت مزاج پوچھی تو لکھا:

"(تم نے) میرا حال پوچھا۔ یہ پرسش حکم نشتر کا رکھتی ہے"۔

ذہنی اور قلبی کشمکش کا یہ دور غالب کی زندگی کا سب سے زیادہ تلخ تجربہ تھا۔ انکی بذلہ سنجی، آزادانہ روش اور شاعرانہ مزاج نے ان کے زخم دل کو بے نقاب نہ ہونے دیا۔ کسی نے زمانہ سازی کا طعنہ دیا، کسی نے انگریز کی خوشامد کا الزام لگایا، انکو مجبوراً کہنا پڑا ع

واں تو میرے نالے کو بھی اعتبار نغمہ ہے

اس سیاسی اور سماجی تبدیلی نے ہندوستان میں جو فکری انقلاب پیدا کیا تھا اس کا اظہار دو طریقوں سے ہوا۔ ایک جہاد سے، دوسرا اجتہاد سے اور حقیقت یہ ہے کہ عہد غالب کے سامنے فکری اور تہذیبی مسائل ان ہی دو کے گرد گردش کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک نے مسائل کا عملی اور دوسرے نے فکری حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔

عملی میدان میں سید احمد شہیدؒ اس دور کی مرکزی شخصیت تھے۔ انھوں نے جہاد کا جو نعرہ بلند کیا تھا اس سے سارا ہندوستان گونج اٹھا تھا۔ بنگال میں فرائضیوں نے جو خود ایک منزل پر سید شہیدؒ کی تحریک سے منسلک ہو گئے تھے، "الارض للہ" (زمین خدا کی ملکیت ہے) اور "ہندوستان دارالحرب ہے" کی آواز اٹھائی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے صحیح لکھا ہے کہ سید شہیدؒ کی آواز ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی ترائیوں سے لے کر خلیج بنگال کے کناروں تک یکساں پھیل گئی تھی۔ مومن جیسا شاعر جو کوچۂ رقیب میں سر کے بل چلتا تھا، پکار اٹھا تھا۔

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب یہ افضل سے افضل عبادت نصیب

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ نے سید احمد شہیدؒ کے ان مکتوبات کی طرف توجہ دلائی ہے جن میں راجہ گوالیار ہندو راؤ کو تحریک آزادی میں شمولیت کی دعوت دی گئی تھی اور لکھا تھا:

"برائے سامی روشن و مبرہن است کہ بیگانگان بعید الوطن ملوک زمین و زمن گردیدہ و تاجران متاع فروش بپایۂ سلطنت رسیدہ، امارت امرائے کبار و ریاست رؤسائے عالی مقدار برباد نمودہ اند و اعتبار ایشاں بالکل ربودہ"

ساتھ ہی ساتھ وہ مسلمانوں کی دینی اور سماجی زندگی میں اصلاح کے لیے کوشاں تھے۔

انھوں نے اور مولانا محمد اسمٰعیل شہیدؒ نے مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کی کتنی ہی کمزوریوں پر انگلی رکھی اور اصلاحات کے لیے پُرخلوص جد و جہد شروع کر دی۔ حالی کا بیان ہے؛

"مسلمانوں میں ظاہراً دو شخصیتوں کے سوا کہ دونوں دلی کی خاک سے اٹھیں، کسی نے سوشل رفارم پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ ایک مولانا اسمٰعیل، دوسرے سید احمد خاں"۔

خود سر سید نے مولانا شہیدؒ کے جذبۂ حق گوئی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اور سید احمد شہیدؒ کا حال لکھتے ہوئے تو آثار الصنادید میں ان کا قلم وجد میں آ گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماں سے ملی ہوئی عقیدت ان کی رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سید احمد شہیدؒ کی تحریک میں اس دور کی تمام تحریکیں ضم ہو گئی تھیں رافضی، وہابی، اہل حدیث وغیرہ وغیرہ۔ حد یہ ہے کہ ٹیپو سلطان کے خاندان کے بچے ہوئے افراد جو کلکتہ میں مقیم تھے وہ بھی ان کے دامن تربیت سے وابستہ ہو گئے تھے سر سید کا بیان ہے کہ بالاکوٹ کی جنگ کے دس پندرہ سال تک مجاہدین کے قافلے پہاڑوں کی طرف جاتے نظر آتے تھے۔ ہندوستان میں شاید ہی کسی مذہبی تحریک نے اتنا زبردست اثر انسانی ذہنوں پر ڈالا ہو۔

۱۸۳۱ء تک انگریزوں نے مصلحتاً سید احمد شہیدؒ کی تحریک کو نظرانداز کیا لیکن ۱۸۵۷ء میں جب جماعت مجاہدین کو پیش پیش پایا تو ان کو "وہابی" کا لقب دے کر ان کی غارت گری پر اتر آئے۔ سر سید نے انگریزوں کی انتقامی آگ کو بجھانے کیلئے وہابیوں اور ان کے مسلک کی مختلف توجیہیں کیں اور خود اپنے آپ کو "وہابی اور نیم چڑھا" کہہ کر حالات کو بدلنے کی کوشش کی۔

غالب کے یہاں اس تحریک کا کوئی ذکر نہیں ملتا حالانکہ جس دلی میں وہ رہتے تھے

وہ جہاد کے نعروں سے پُرشور تھی۔ ان کی زندگی کے آخری سال تھے جب انبالہ اور پٹنہ کے تاریخی مقدمات سازش چلائے گئے تھے۔ ان مقدمات نے عوام کے جذبات میں ایک آگ سی لگا دی تھی۔ الدر المنثور میں مولانا عبدالرحیم نے اپنے چچا مولانا ولایت علی عظیم آبادی اور دیگر مجاہدین کے حالات لکھے ہیں ۱۸۶۵ء میں عید کے دن ان کے مکانوں کو جس طرح مسمار کیا گیا، اس کا حال مولانا عبدالحمید نے ایک مثنوی میں لکھا ہے۔

چوں شب عید را سحر کردند
ہمہ را از مکاں بدر کردند!

ضبط و تاراج جملہ مال و متاع
اشتر و فیل و گاو و اشتر و اسپ

باغ را منازل دل چسپ
آں بناہائے شامخ و محکم

کہ بہ گیتی بود عدیلش کم!
اندراں خانہ طالباں چوں نجوم

روز و شب مشتغل بہ درس علوم
جملہ دیوار و سقف و خانہ و در

بیل زن کردہ منہدم یکسر

غالب کی کسی نظم، کسی خط، کسی تحریر میں اس تحریک کا ذکر نہیں ملتا۔ سوائے اس کے کہ مومن کے انتقال پر، جو اس تحریک جہاد کے زبردست داعی تھے۔ انھوں نے کہا تھا؎

کافر باشم اگر بہ مرگ مومن
چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

دہلی میں شاہ ولی اللہ محدثؒ کا گھرانا علمی، دینی اور سیاسی جد و جہد کا مرکز تھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ کی مسند درس کی بادشاہت پورے ہندوستان پہ پھیلی ہوئی تھی۔ انھوں نے ہندوستان کے "دارالحرب" ہونے کا فتویٰ دے کر مذہبی ذہن کو عملی جد و جہد کی طرف

لگا دیا تھا۔ مسجد اکبر آبادی میں جہاد کے درس دیے جاتے تھے، اسی بنا پر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے اس مسجد کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے بھائی، عزیز اور شاگرد جن میں شاہ عبدالقادرؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالغنیؒ، شاہ مخصوص اللہؒ، مولانا محمد اسحاقؒ، نواب قطب الدین خاںؒ وغیرہم شامل تھے، اپنے فضل و کمال میں بے مثال تھے اور ان کی موجودگی نے دلی کی علمی فضا کو انحطاط کے دور میں بھی چار چاند لگا دیے تھے۔ بقول میرؔ ؎

دل و دلی گرچہ دونوں ہیں خراب   پہ کچھ لطف اس اجڑے نگر میں بھی ہے

غالب کے یہاں خاندان ولی اللہی کی ان عظیم المرتبت شخصیتوں سے تعلق کے اشارے نہیں ملتے۔ مثنوی ششم میں ایک مقام پر صرف اتنا لکھا ہے یا لکھنے پر مجبور ہو گئے ہیں

مولوی معنوی عبدالعزیز   وان رفیع الدین دانش مند

شاہ عبدالقادر دانش سگال   کایں دو تن را بود در گوہر ہمال

اس خاندان سے کسب فیض کرنے والوں میں دو عالم مفتی صدرالدین آزردہؒ اور مولانا فضل حق خیرآبادیؒ غالب کے خاص دوستوں میں تھے۔ ہر چند کہ خاندان ولی اللہی کا ذکر نہ ہونا تعجب خیز ہے لیکن یہ گمان صحیح نہ ہوگا کہ غالب شاہ صاحبؒ کے علمی مقام سے ناواقف تھے۔ حالی کا بیان ہے کہ مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور ان کو خوب سمجھتے تھے۔ ایک بار نواب مصطفی خاں شیفتہ نے شاہ ولی اللہؒ کا کوئی رسالہ مفہوم سمجھنے کے لیے پیش کیا۔ غالب نے اس کا مطلب ایسی خوبی سے سمجھایا کہ بقول حالی شاہ ولی اللہ بھی شاید اس سے زیادہ بیان نہ کر سکتے۔

تصور جہاد انگریزی سامراج کے لیے سب سے بڑا خطرہ تھا۔ اس کو باطل قرار

دینے اور ذہن کو ادھر سے ہٹانے کے لیے مختلف نوعیت کی تدابیر کی گئیں۔ اس مسئلہ کی حمایت میں زبان کھولنی دار و رسن کو دعوت دینی تھی۔ غالب کے عزیز ترین دوست مولانا فضل حق خیرآبادیؒ نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا تھا۔ الثورۃ الہندیہ میں انھوں نے ۱۸۵۷ء کے دردناک حالات بیان کیے ہیں۔ وہ انڈمان میں نظربند کر دیے گئے تھے۔ غالب پر اپنے دوست کے مصائب کا کیا اثر ہوا اس کی تفصیل نہیں ملتی۔ آزردہ نے جہاد کے فتویٰ پر دستخط تو کر دیے لیکن نام کے آگے الجر لکھ دیا۔ دستخط کرانے والوں نے الخیر سمجھا۔ بعد کو انھوں نے انگریزوں کے سامنے اس کو "الجبر" بتا کر اپنی جان بچائی۔ لیکن ان کا ذہنی احساس پکارتا رہا ؎

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے   سر ہے اور جوشش جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے

ٹکڑے ہوتا ہے جگر جان پہ بن جاتی ہے   مصطفی خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیوں نہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو

قتل اس طرح بے جرم جو صہبائی ہو

غالب نے اس طرح آہ و زاری نہیں کی۔

تلقین جہاد کے دو پہلو تھے۔ ایک نئے حالات میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید اور دوسرے ائمہ مذاہب کی قطعیت سے انکار۔ برطانوی اقتدار کے قیام اور نئی تہذیبی قدروں کے رواج نے از سر نو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اگر اس دور کے فتاویٰ کے مجموعے دیکھے جائیں تو اندازہ ہوگا کہ کس کس طرح یہ مسائل ابھر کر سامنے آرہے تھے۔ مثال کے طور پر اگر مولانا عبدالحی فرنگی محلی (۱۸۴۸ - ۱۸۸۶) کے فتاویٰ پیش نظر ہوں تو معاملہ کی نوعیت واضح ہو جائے گی۔ کیا چلتی ہوئی گاڑی میں نماز ادا ہو سکتی ہے؟ (ج ا ص ۲۹)؛ کیا

رویت ہلال کی شہادت تار کے ذریعہ دی جاسکتی ہے؟ (ج ۱ ص ۷۷) کیا سگار اور سگریٹ کا پینا جائز ہے؟ (ج ۱ ص ۸۰)؛ کیا ایسی انگریزی دواؤں کا استعمال جائز ہے جن میں کوئی مشکوک جزو نشیلی دوا کا ہو؟ (ج ۱ ص ۳۲۹)؛ کیا ہندوستان دارالحرب ہے؟ (ج ۱ ص ۱۶۰۔۱۶۱)؛ کیا انگریزی تعلیم جائز ہے؟ (ج ۱ ص ۳۳۵)؛ کیا فیکٹری میں بنا ہوا کپڑا پہننا جائز ہے؟ (ج ۲ ص ۵۰۔۵۱)؛ کیا اسٹامپ فیس کا ادا کرنا اور بعد کامیابی مقدمہ واپس وصول کرنا جائز ہے؟ (ج ۲ ص ۳۴۲)؛ کیا پنشن قبول کرنا جائز ہے؟ (ج ۳ ص ۱۱۲)۔ یہ اور ایسے بے شمار مسائل تھے جن کو مجتہدانہ فکر کے سہارے ہی حل کیا جاسکتا تھا!

اجتہادی فکر کی ضرورت اور نوعیت کا اظہار مختلف انداز سے ہوا: (۱) سرسید نے سائنس اور مذہب کے درمیان تطبیق کی کوشش کی۔ (۲) اہل حدیث نے جو غیر مقلد کہلائے، مذاہب اربعہ سے تعلق منقطع کیا اور ایک نوع کی فکری آزادی اختیار کی، لیکن مذہب کے متعینہ حدود کے اندر رہ کر۔ (۳) اہل قرآن نے فقہی مذاہب کے ساتھ ساتھ حدیث کی قطعیت کو بھی ماننے سے گریز کیا۔ (۴) پھر ایک طبقہ ایسا بھی سرگرم عمل ہوا جو صرف تقلید کو فلاح کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ ان کے اعتقاد و عمل کا آئینہ دار اقبال کا یہ شعر ہے ؎

مضمحل گردد چو تقویم حیات ملت از تقلید می گیرد ثبات

ان سب طریقہ ہائے فکر نے مذہبی اعمال اور اعتقادات پر اثر ڈالا۔

سرسید نے جس خلیج کو پُر کرنے کی کوشش کی تھی وہ تاریخ عالم کا ایک خاصہ تھا جب بھی مذہب اور سائنس مخالفانہ روبرو آئے ہیں اس مخالفت کو دور کرنے کی جد وجہد کی گئی ہے۔ یورپ میں معرکۂ دین و سائنس برپا ہوا لیکن جلد ہی ختم ہوگیا۔ ہندوستان

میں یہ میدان کافی عرصہ بعد سجا اور مدتوں تک جنگ جاری رہی۔ سرسید نے اس خلیج کو پُر کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ وقت گزرنے کے ساتھ غیر ضروری ہوگئی اور مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں اس طرز فکر کو مسترد کردیا اس لیے کہ مذہبی فکر اب معرکۂ دین و سائنس سے نکل کر نئے میدانوں میں داخل ہوچکی تھی۔

مغربی سائنس کی جانب ہندوستانی مسلمانوں کا ذہن سترہویں صدی میں مائل نظر آتا تھا۔ دانش مند خاں کے یہاں فرانسیسی ڈاکٹر سائنس کے تجربات کرتے تھے۔ فرانسیسی کتابوں کے ترجموں کی کوشش بھی کی جاتی تھی۔ لیکن انیسویں صدی میں سائنس اور مغربی علوم کی طرف ایک مخالفانہ رویہ ابھر آیا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ مغربی علوم انگریزوں کے سیاسی اقتدار کے جلو میں آرہے تھے۔ صنعتی انقلاب نے زندگی کا نقشہ جس طرح بدل دیا تھا اس کا سب سے پہلے ٹیپو سلطان کو احساس ہوا۔ اس نے مغربی طرز پر فوج کی تنظیم کرنی چاہی، بحری بیڑے تیار کیے، بیرونی ممالک میں تجارتی منڈیوں کے قیام کی تدابیر سوچیں اور سائنس کی ایجادات سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ لیکن وہ اس جد و جہد میں تنہا رہ گیا۔ اس کے بعد کافی عرصہ تک اس طرف کسی نے توجہ نہ کی۔

غالب کا سائنس کی طرف رویہ آئین اکبری کی تقریظ سے ظاہر ہے۔ آئین اکبری کی اہمیت سے ان کا انکار بے معنی تھا لیکن بقول مولانا آزاد ان کے استدلال سے جدید فنون کے علم و اعتراف کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اجتہادی فکر کا دوسرا منظر وہابی علماء اور مجاہدین تھے۔ انھوں نے اتباع شریعت پر زور دیا اور سماجی اصلاح کی مختلف تدابیر اختیار کیں۔ نکاح بیوگان کی تحریک شروع کی اور غلط رسوم کے خلاف صف آرا ہوگئے۔ ایسا خیال ہوتا ہے کہ مولانا حالی اس

انداز فکر سے متاثر ہوگئے تھے۔ انھوں نے نواب صدیق حسن خاں کی تائید میں ایک رسالہ لکھا تھا اور اتباع شریعت کی طرف غالب کی توجہ مبذول کرانے کی بھی کوشش کی تھی اور کہا تھا کہ نماز پنج گانہ کی پابندی کریں۔ کھڑے ہو کر نہ ہوسکے تو بیٹھ کر، وضو نہ ہوسکے تو تیمم ہی سے۔ غالب کا ان دنوں یہ حال تھا کہ "سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر"، حالی نے اپنی درخواست لکھ کر پیش کی۔ غالب کی طبیعت نے جو رسم و تقلید کی تمام بندشوں سے آزاد ہو چکی تھی۔ چند اشعار میں بات کو ٹال دیا اور اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔

غالب، جہاد و اجتہاد کی کسی تحریک سے متاثر نہیں ہوئے۔ نواب صدیق حسن خاں نے فارسی نثر کی کچھ عبارتیں ان سے پڑھی تھیں۔ انھوں نے شاگردی کے تعلق کو نبھایا اور دو موقعوں پر ان کی مدد کی۔ ایک اس وقت جب جوے کے مقدمے میں وہ پھنسے تو شیفتہ نے نواب صدیق حسن خاں کی مدد سے ان کی رہائی کرائی۔ دوسرے جب خود شیفتہ گرفتار ہوئے تو غالب نے نواب صدیق حسن خاں کو لکھ کر ان سے مدد کرائی۔ بایں ہمہ غالب نے ان سے کسی طرح کا تعلق نہیں رکھا۔ ان کے بڑے بھائی سید احمد حسن قنوجی نے خط لکھا تو ان کو پہچاننے سے انکار کر دیا اور ایک جملہ بڑا پر معنی لکھا۔

"نامہ نگار کا حال بہ سبیل اجمال یہ ہے کہ سیاست سے محفوظ رہا ہوں اور حکام کی عنایت سے محظوظ رہا ہوں"۔

ایک ایسے دور میں جب جہاد اور دارالحرب کے تصورات مسلمانوں کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے حکمراں سیاست نے یہ ضروری سمجھا کہ ان کو ایسے مسائل میں الجھا دیا جائے جن کا زندگی اور مسائل زندگی سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ نواب حبیب الرحمٰن خاں

شروانی مرحوم کا بیان ہے کہ انگریز حکام اس زمانہ میں خود مذہبی اختلافات پیدا کر کے مختلف گروہوں میں تصادم کا سامان مہیا کرتے تھے۔ اقبال نے اسی صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

ابن مریم مرگیا یا زندۂ جاوید ہے؟ — ہیں صفات ذات حق، حق سے جدا یا عین ذات؟
آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے — یا مجدد جس میں ہوں فرزند مریم کے صفات؟
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم — امت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
تم اُسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے — تا بساط زندگی میں اسکے سب مہرے ہوں مات؟

امتناع نظیر خاتم النبیین، امکان کذب، رفع یدین، استمداد و توسل، آمین بالجہر وغیرہ مسائل جن پر اس زمانہ میں کافی بحث و مباحثے ہوئے اور مولانا فضل حق خیرآبادی بھی نہ صرف ان میں پھنس گئے بلکہ غالب کو بھی اس میں گھسیٹنے کی کوشش کی۔ غالب نے دوستی کا حق نبھایا۔ لیکن اس بحث میں دور تک نہیں گئے۔ برطانوی سیاست نے ذہن کو جہاد اور دارالحرب سے ہٹا کر ان مسائل میں ایسا الجھایا کہ مدتوں ذہن ان سے باہر نہ نکل پائے۔ عید میلاد النبی کو غالب نے "دلکش و جان پرور" کہا اور عرسوں کی اجتماعی حیثیت کے متعلق لکھا۔

گر پے ترویح روح اولیاء است — در حقیقت آں ہم از بہر خدا است

غالب کا دل عشق رسول ؐ سے بھرا ہوا تھا۔ ان کا یہ شعر ؎

ہر کجا ہنگامہ عالم بود — رحمۃ اللعالمینے ہم بود

اقبال کے دل پر کچھ اس طرح اثر انداز ہوا کہ وہ بے اختیار پکار اٹھے ؎

نالہ کو خیزد از سوز جگر — ہر کجا تاثیر او دیدم دگر

قمری از تاثیر او واسوختہ　　　بلبل از بوے رنگہا اندوختہ

غالب نے اس شعر میں ایک قرآنی ارشاد کو کس عقیدت سے پیش کر دیا ہے ؎

ہر کس قسم بانچہ عزیز است می خورد　　　سوگند کردگار بجانِ محمد است

غالب کو تصوف سے دلچسپی تھی، اس لیے نہیں کہ وہ اخلاقِ انسانی کی اصلاح و تربیت کا ایک عظیم الشان لائحہ عمل تھا بلکہ اس لیے کہ ان کی آزادیٔ فکر کو اس سے کچھ تقویت پہونچتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ وہ اپنی دکھتی ہوئی کمر تصوف کی دیوار سے لگا لیتے تھے۔ لیکن اس میں بھی ان کو اپنے درد کا درماں نہ ملا۔ وہ صرف اس حد تک تصوف کے حامی تھے جہاں تک ان کی آزادیٔ فکر و عمل پر اثر انداز نہ ہو۔ انھوں نے اپنے خسر مرزا الٰہی بخش خاں معروفؔ کے ساتھ جو پیری مریدی بھی کرتے تھے، شجرہ کے سلسلہ میں جو مذاق کیا تھا اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالب کی آزادیٔ طبع تصوف کی عائد کردہ پابندیوں یا رسوم کو بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ وہ نہ وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل کے قائل تھے، نہ خاک کے آغوش میں راتوں کو مناجات کے۔ انھوں نے دنیا کو صرف معاشی عینک سے دیکھنا چاہا۔ ایک موقع پہ کہتے ہیں۔

در عالم بے زری کہ تلخ است حیات　　　طاعت نتواں کرد بامیدِ نجات

اے کاش ز حق اشارتِ صوم و صلوٰۃ　　　بودے بوجود مال چوں حج و زکوٰۃ

یومِ حساب اپنی بے زری کو شراب نوشی کا جواز بنا کر داورِ محشر کے سامنے اس طرح لب کشا ہوتے ہیں :

حساب مے و رامش و رنگ و بو　　　ز جمشید و بہرام و پرویز جو

کہ از بادہ تا چہرہ افروختند　　　دل دشمن و چشم بد سوختند

نہ از من کہ از تاب مے گاہ گاہ　　　بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ

جہاں از گل و لالہ و پُر بوے و رنگ　　　من و حجرہ و دامنے زیرِ سنگ

شراب نوشی کا سبب کہیں افراطِ زر اور افزونیِ عیش و نشاط ہوتا ہے تو کہیں غربت، بے زری، بدحالی اور غمِ روزگار بھی اس کوچہ میں لے جاتا ہے۔ ایک بار قرض خواہوں نے غالب پر مقدمہ دائر کر دیا۔ مفتی صدرالدین آزردہؔ کی عدالت میں پیشی ہوئی۔ غالب نے یہ شعر پڑھا ؎

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں　　　رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

آزردہؔ مسکرا دیے اور اپنے پاس سے انکے قرضے کا روپیہ ادا کر دیا۔

غالب زندگی کی سب سے بڑی حقیقت معاشی مسئلہ کو سمجھتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ معاشی زبوں حالی اس وقت اپنی آخری منزل پر پہونچی ہوئی تھی۔ شاہ ولی اللہؒ پہلے مسلمان مفکر تھے۔ جس نے سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے معاشی اسباب تلاش کیے تھے۔ میرؔ نے عوام کی بے بسی کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

اب خرابا ہوا جہان آباد　　　ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

بے زری کا نہ کر گلہ غافل　　　رہ تسلی کہ یوں مقدر تھا

اس دور میں لکھے گئے "شہر آشوب" سماج کے ہر طبقہ کی غربت، بے بسی اور بدحالی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کے آخری دور میں شہزادے جن کو "سلاطین" کہا جاتا تھا، چھتوں پر چڑھ کر آوازیں لگاتے تھے: "ہم بھوکے مرتے ہیں" "ہم بھوکے مرتے ہیں"۔ غالب نے پنشن و عطیات کے سہارے اپنی زندگی تو کسی طرح گزار دی، گو انھیں بھی

بعض اوقات جوئے کی سرپرستی جیسے ذرایع آمدنی کی مدد لینی پڑی، لیکن معاشی حالات کی تبدیلی اور بدحالی ان کے لیے عذاب جان بن گئی۔ انھوں نے نئے نظام کو برا نہیں کہا، حالات اور زمانہ اس کی اجازت نہ دیتے تھے لیکن ان کی پوری زندگی اس پر تنقید تھی۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ زمانہ کی بے مہریوں سے بے بس ہوکر غالب نے "اپنی قدیم سرگرانیاں تقریباً بھلا دی تھیں اور عام مداحیوں پر اتر آئے تھے۔"

غالب کی دلی علم و ادب کا گہوارہ تھی۔ علماء و امراء کے دیوان خانے علمی سرگرمیوں کے خصوصی مرکز تھے۔ امام بخش صہبائی، صدرالدین آزردہ، نواب ضیاءالدین خاں نیر درخشاں، حکیم مومن خاں مومن، مصطفےٰ خاں شیفتہ، شاہ نصیرالدین نصیر کی محفلیں ایسی تھیں کہ بقول مولانا حکیم سید عبدالحئی مرحوم

"جب یہ لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا"

غالب نے لکھا تھا۔

ہند را خوش نفسا نند سخنور کہ بود	باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومن و نیر و صہبائی و علوی و انگاہ	حسرتی، اشرف، و آزردہ بود اعظم شاں

آزردہ کو مولانا حکیم سید عبدالحئی مرحوم نے "سرمایہ نازش ہندوستان" بتایا ہے۔ مولانا آزاد کے والد کی رائے تھی کہ "ادب عربی کا ذوق ان سے بڑھ کر وقت کے کسی فاضل میں" نہیں دیکھا گیا۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ آزردہ ہی نے غالب کو "طرز بیدل" سے ہٹایا۔ انھوں نے ۱۸۴۲ء میں غالب کو دلی کالج میں فارسی کے مدرس کی جگہ پیش کرائی تھی۔

سرسید اور مولانا آزاد کے والد جب دلی کے دیوان خانوں کی علمی فضا کو یاد

کرتے تھے تو ان کی آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں۔ ان کے خاتمے نے غالب کی ادبی زندگی میں ایک خلا پیدا کر دیا۔ مکتوبات سے صاف ظاہر ہے کہ غالب جس بحث میں جم کر حصہ لیتے تھے وہ زبان و ادب سے متعلق ہوتی تھی۔ جب زبان سے متعلق کوئی مسئلہ سامنے آتا تو ان کا علم پوری طرح حاضر نظر آتا۔ غالب نے فارسی زبان و ادب کی رفتار پر پوری نظر رکھی۔ مولانا شبلیؒ نے لکھا ہے کہ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا صحیح مذاق ختم ہو چکا تھا، مرزا مظہر جان جاناں کے خریطۂ جواہر نے دوبارہ پیدا کیا۔ غالب نے ہندوستان کے فارسی شعراء کو اپنے ادبی اعلیٰ معیار پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ امیر خسروؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے سخن وروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا۔ خسرو کیخسرو قلمرو سخن طرازی ہے یا ہم چشم نظامی گنجوی و ہم طرح سعدی شیرازی ہے۔"

وہ خود کو بہادر شاہ ظفر کا امیر خسرو سمجھتے تھے ؎

طے دوم رشدوں کو قدرت حق سے ہیں دو طالب	نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب

وہ فیضی، ناصر علی، بیدل اور غنیمت کو کسی شمار میں نہیں لاتے تھے۔ شبلیؒ اور اقبال کی فارسی شاعری غالب کی قائم کی ہوئی روایات کو ایک خراج تحسین ہے۔

غالب اپنے سماجی نظریات اور وسیع المشربی میں مغلیہ دور کی تہذیب کے بہترین ترجمان تھے۔ جن فکری اور قلبی محرکات نے ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی پرورش کی تھی وہ غالب کی زندگی کا جزو بن چکے تھے۔ ان کے ہندو دوستوں اور تلامذہ کی کثیر تعداد تھی جو ان کو اتنے ہی عزیز تھے جتنے مسلمان شاگرد۔ مرزا ہرگوپال تفتہ، پیارے لال آشوب،

جواہر سنگھ جوہر، منشی ہیرا سنگھ وغیرہ کے نام ان کے خطوط خلوص، محبت اور یگانگی کے جذبات کے آئینہ دار ہیں۔ مثنوی سیوم میں جس طرح بنارس کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی فضا کو "بہشت خرم فردوس معمور" ٹھہراتے ہیں وہ ان ہی جذبات کی عکاسی کرتا ہے جن کے تحت حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ نے کہا تھا ع

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

اگر غالب کی پوری زندگی اور ان کی ذہنی اور قلبی کیفیات پر نظر ہو تو تسلیم کرنا پڑیگا کہ قدیم و جدید کی کشمکش ان کے پیکر میں کچھ عجیب انداز سے رونما ہوئی اور انکی شخصیت کی بنیادی حقیقتوں کو متاثر کیے بغیر گزر گئی۔ گویا قسام ازل نے جب ہندوستان کی تہذیبی اور سیاسی بساط کو الٹنے کا فیصلہ کیا تو غالب کے کان میں کہدیا تھا۔ ؎

چوں عکس پل بسیل، بذوق بلا برقص

جا را نگاہ دار و ہم از خود جدا برقص

اُردو نعت گوئی کے موضوعات

از

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف میں سب سے پہلے لفظ "نعت" کا استعمال غالباً حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے یہاں ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ فرماتے ہیں:-

من راٰہ بداھۃ ھابہ	جس نے یکایک آپ کو دیکھا وہ ہیبت زدہ
ومن خالطہ احبہ یقول	ہوگیا اور جو آپ سے ملا وہ آپ کا گرویدہ
ناعتہ لم ار قبلہ ولا	ہوا۔ آپ کا وصف کرنے والا یہی کہتا
بعدہ مثلہ صلی اللہ علیہ	ہے کہ آپ سے پہلے نہ آپ جیسا دیکھا
وسلم (شمائل ترمذی)	اور نہ آپکے بعد آپ جیسا دیکھوں گا۔

نعت میں دراصل محض پیکر نبوت کے صوری محاسن کا بیان یا حضورؐ سے رسمی عقیدت کا اظہار ہی نہیں ہوتا، بلکہ ہر وہ شعر نعت کے دائرے میں آجاتا ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح ہو یا آپؐ سے بالواسطہ یا بلاواسطہ خطاب ہو اور جس کا تاثر ہمیں آپؐ کی ذات گرامی سے قریب کر دے۔

حضورؐ کی نعت کا سب سے بڑا سرچشمہ قرآن حکیم ہے جو خود آنحضرتؐ پر بصورت وحی کم و بیش ۲۳ سال تک نازل ہوتا رہا۔ اسی لیے ام المومنین حضرت عائشہؓ نے خلق محمدی کی

تعریف میں "خلقہ القرآن" کہہ کر ساری کتاب آسمانی کو نعت کے موضوع سے جوڑ دیا تھا۔

قرآن حکیم میں مختلف طریقوں سے آپؐ کی تعریف و توصیف بیان ہوئی ہے جن کے ذریعہ آپؐ کی بشریت، عبدیت، رسالت، اسوۂ حسنہ، نورانیت اور فضیلت وغیرہ کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم نے

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ	اے محمدؐ! کہو کہ میں تو تم جیسا ایک انسان
يُوحٰى اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ	ہوں۔ میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ
وَّاحِدٌ (الکہف ۱۱۰)	تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے۔

کہہ کر کبھی تو حضورؐ کی بشریت کا اظہار کیا۔ اور

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (الانشراح ۴)	ہم نے تمہارے لیے تمہارا ذکر بلند کیا۔

میں آپؐ کی بزرگی و برتری ثابت کر دی۔ پھر آپؐ کے طریقے کو ہی فلاح کا ضامن قرار دیتے ہوئے فرمایا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ	بے شک تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ
اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب آیت ۲۱)	علیہ وسلم کے طریقے میں اچھا نمونہ ہے۔

اور

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران آیت ۳۱) کہہ کر صاف صاف بتلا دیا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرنے لگے تو اس کے لیے شرط یہ ہے کہ تم میرا اتباع کرو۔ کہیں یوں کہا گیا کہ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (سورہ النساء ۸۰) دوسری جگہ فرمایا کہ:۔

اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا	بے شک ہم نے آپؐ کو حق کے ساتھ

وَّنَذِيْرًا (البقرہ ۱۱۹)	بھیجا خوشخبری اور ڈر سنانے والا۔

کبھی آپؐ کو یٰسین وطٰہٰ کہہ کر مخاطب کیا گیا تو کبھی مزمل و مدثر کہہ کر۔ قرآن میں کہیں النبی الامی تو کہیں رحمۃ للعٰلمین اور کہیں شاہداً و مبشراً جیسی صفات کا بیان ہے کہیں یہ حکم دیا گیا کہ:۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ	تحقیق اللہ اور اس کے فرشتے درود
عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	بھیجتے ہیں اس نبیؐ پر اے ایمان والو تم
صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا	درود بھیجو۔

(احزاب ۵۶)

پھر اللہ نے اپنی عنایات کی بارش آپؐ پر کی اور حضورؐ پر اپنی حجت تمام کر دی۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (المائدہ ۳)

اس کے بعد ایک نظر احادیث پر بھی ڈال لیں۔ بعض احادیث میں آپؐ نے خود اپنے مرتبے کو بیان فرما دیا ہے۔ مثلاً حضرت انسؓ بن مالک سے مروی ہے کہ:۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ	حضورؐ نے فرمایا۔ "لوگ جب اٹھائے
علیہ وسلم انا اول الناس	جائیں گے تو میں پہلا شخص ہوں گا۔
خروجا اذا بعثوا وانا خطیبهم	اور جب وفد بنا کر پیش ہوں گے تو
اذا وفدوا وانا مبشرهم	میں ان کی ترجمانی کروں گا اور میں
اذا ایئسو لواء الحمد یومئذ بیدی	ان کو بشارت دوں گا، جب وہ
وانا اکرم ولد آدم علی ربی	ناامید ہوں گے اس دن میرے
ولا فخر (الترمذی۔ باب المناقب ص۲)	قبضے میں حمد کا پرچم ہوگا اور میں

اپنے پروردگار کے نزدیک اولاد
آدم میں سب سے زیادہ مکرم ہوں گا
اور یہ فخر نہیں ہے۔

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے آپؐ کے جو اوصاف بیان کیے ہیں احادیث کے باب المناقب میں درج ہیں۔ حضرت علیؓ کا جو قول اوپر گذر چکا ہے وہ نعتیہ مضمون کا عمدہ نمونہ ہے۔ مناقب کے باب میں اس طرح کے کئی تعریفی کلمات آپؐ کی شان مبارک میں بیان ہوئے ہیں۔ ترمذی نے "شمائل" کے عنوان سے ایک الگ باب قائم کیا ہے جس میں حضورؐ کے سراپا کا بیان ہے اور آپؐ کے تواضع اخلاق، مذاق، عبادات اور بسر اوقات وغیرہ تمام کیفیات و طریقہ ہائے حیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صحابہؓ کرام اور تابعینؒ عظام کی طرف سے تدوین احادیث کے لیے کی جانے والی کاوشیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و وارفتگی اور جذبۂ عشق صادق کا نادر نمونہ ہیں۔ آپؐ سے اسی طرح کے قلبی لگاؤ اور محبت و انسیت کی ترجمانی کے لیے بعض حضرات نے شاعری کا سہارا لیا اور عربی میں "المدائح النبویۃ" کے عنوان سے ایک نئی صنف شاعری کو وجود بخشا، جس کا وافر ذخیرہ عربی شعری سرمایے میں اضافہ کا باعث ہوا ہے۔ شیخ یوسف بن اسمٰعیل النبہانی نے ۱۳۲۰ھ میں "المجموعۃ النبہانیۃ فی المدائح النبویۃ" کے نام سے چار جلدوں میں عربی نعتوں کو جمع کیا ہے[۱]۔ عربی زبان کے بعد بقول مولانا ابوالحسن علی ندوی۔

"فارسی زبان کا قدم اس وادیٔ ایمن کی رہ نوردی میں سب سے آگے رہا ہے"[۲]

یہاں ان دونوں زبانوں کی نعتیہ شاعری کی تاریخ سے صرف نظر کرکے اردو

نعتیہ شاعری کے موضوعات پر اظہار خیال کرنا مقصود ہے۔ اردو کے نعت گو شعراء نے دوسری اصناف کی طرح اس صنف میں بھی عربی۔ فارسی کے نمونوں کو اپنے پیش نظر رکھا، لیکن عام اصناف کی طرح جابجا عرب و ایران کی روایات سے ہٹ کر بھی کچھ باتیں لکھی ہیں۔ اردو کے نعتیہ اثاثہ کو مختلف موضوعات کے دائرے میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) خالص نعت (۲) مولود نامے (۳) نور نامے (۴) معراج نامے (۵) وفات نامے (۶) اسرائیلیات (۷) ضمنیات وغیرہ۔

(۱) نعت خالص

نعت خالص سے مراد وہ نعتیہ کلام ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف اوصاف کا بیان ہو، جو محامد و محاسن اور تعریف و توصیف کی حد تک ہی محدود ہو۔ اردو کے ایسے نعتیہ ذخیرہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور کئی کتابیں بھی اس ضمن میں موجود ہیں لیکن واقعات رسولؐ کو نعت کے جن موضوعات کے ذیل میں قلم بند کیا گیا ہے یہاں اسی کا تذکرہ مقصود ہے۔ اس ضمن میں ولادت رسولؐ کو موضوع بنا کر لکھی گئی نعتیں "میلاد نامہ" کے ذیل میں شمار کی جا سکتی ہیں۔

(۲) میلاد نامے

مولود ناموں کی روایت اردو میں بہت قدیم ہے۔ عربی۔ فارسی سے ہوتی ہوئی یہ روایت اردو ادب تک پہنچی۔ ذکر مولود پر سب سے پہلی کتاب ابوالخطاب عمر بن حسن بن وحیہ کلبی اندلیسی نے لکھی تھی۔ ابن خلکان اس کتاب کا نام "التنویر فی مولد السراج المنیر" بتاتے ہیں۔ لیکن بعض لوگ اُسے التنویر فی مولد البشیر والنذیر کہتے ہیں۔ اربل کے سلطان ابو سعید مظفر نے کتاب کے مصنف کو اس کے صلے میں ایک ہزار اشرفیاں بطور انعام دی تھیں۔ "تاریخ میلاد" کے مصنف نے "انوار ساطعہ" کے حوالے سے "مولود" کی چند اہم کتابوں کے نام گنوائے ہیں، جن میں (۱) حافظ

شمس الدین دمشقی کی "مورد الصادی فی مولد الہادی" (۲) محمد بن عثمان لولوی کی "الدر المنظم فی مولد النبی الاعظم" ابن جزریؒ کی "عرف التعریف فی مولد الشریف" اور مجد الدین قاموس کی "نفحات العنبریہ فی مولد خیر البریۃ" وغیرہ مشہور ہیں۔

نفس ذکر میلاد النبیؐ کو بعض علمائے اسلام صرف باعث خیر و ثواب ہی نہیں بلکہ مستحب و سنت قرار دیتے ہیں غالباً اسی لیے اردو کے شعری سرمایے میں میلاد ناموں کی کثرت ہے اکثر شعراء نے خیر و برکت اور ثواب حاصل کرنے کے لیے میلاد نامے لکھے اور مجالس میں پڑھے جن کا احاطہ باعث طوالت ہوگا اس لیے صرف مشہور اور پختہ مشق شعراء کی تصانیف کے ذکر پر اکتفا کیا جائے گا۔

اردو شاعری میں "ذکر میلاد النبیؐ" کو سلطان محمد قلی قطب شاہ سے پہلے کسی نے بھی مستقل طور پر منظوم نہیں کیا۔ محی الدین قادری زورؔ مرحوم، حدیقۃ السلاطین، کے حوالے سے نقل کرتے ہیں:۔

"محمد قلی قطب شاہ عید میلاد النبیؐ کی بزم آرائی اور آئین بندی فضائے دلکشائے میدان داد محل میں کیا کرتا تھا...... عید میلاد النبیؐ کی آمد سے بہت قبل ہی صناع، ہنرمند اور استادان صنعت و حرفت دونوں عمارتوں کے سامنے (چاوڑی خانہ اور کوتوال خانہ) اپنے عجیب و غریب کمالات کی پیشکش میں مشغول ہو جاتے اور آخر کار جب روز مولود ..... آجاتی تو کوسوں، دماموں، نقاروں، نفیریوں اور قرناؤں کی آوازوں سے میدان داد محل گونج اٹھتا تھا[۳]"

قلی قطب شاہ ہر یوم میلاد النبیؐ کے موقع پر ایک نظم اسی موضوع پر لکھا کرتا تھا۔ اس کے کلیات میں بھی عید میلاد پر چھ نظمیں اور ایک قصیدہ ملتا ہے۔ جن میں شاعر نے

میلاد النبیؐ کی عظمت بیان کی ہے۔

فرشتے سرگ ساتوکوں ستاریاں سوں سنوارے ہیں — شہ دنیا و دیں کے تئیں عرش کرسی سنگارے ہیں
مگر مولود ہے شہ کا عرش اوپر طبل کا جے — مراداں پاؤنے سارے جگت ہاتاں پسارے ہیں

دوسری نظم میں شاعر نے "لولاک لما خلقت الافلاک" کی تصریح کی ہے شاعر کہتا ہے تمام دنوں میں اللہ نے اس دن کو فضیلت بخشی۔ یہ گنہ گاروں کی خلاصی کا دن ہے اور بہشتیوں کو اس دن نور کے لباس پہنائے جاتے ہیں۔ تیسری نظم میں اگرچہ ہندی الفاظ کی بہتات ہے لیکن شاعر نے صنائع بدائع کا وافر استعمال صرف اسی ایک نظم میں نہایت فراخدلی سے کیا ہے۔ صنعت تجسیم کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

خوش ہو خوشی ہنستی اہے، ہور عیش متوالا ہوا — عشرت لگیاں ناچنے، آلاپ جب گایا نند شہ

عیش کا متوالا ہونا، عشرت کا ناچنا اور خوشی کا خوش ہو کر ہنسنا وغیرہ انوکھے اور نئے خیالات ہیں اور یہ تمام الفاظ مسرت و خوشی کے مظہر ہیں۔ اسی موضوع پر قلی قطب شاہ کا قصیدہ بھی کافی طویل ہے۔ شاعر نے بعثت نبویؐ پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔

عبداللہ قطب شاہ (م ۱۶۷۲ء) کے مختصر سے دیوان میں "مولود شریف" پر دو نظمیں ملتی ہیں۔ اول نظم بہاریہ عنصر لیے ہوئے ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت چونکہ موسم بہار ہی میں ہوئی تھی اسی مناسبت سے شاعر نے اس نظم میں "جھاڑوں کے بوارنے" غنچوں کے چٹخنے، گلوں کے کھلنے وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے ؎

جھلک ہو مولود کا بھی جگ میں آیا — جگت سب اس جھلک تے جگمگایا
منگن کرتے گگن ہو کر ہر اک جھاڑ — سورج ہور چاند تارے بار لیایا[۴]

اسی عہد میں علاقہ بھروچ کے ایک غیر معروف شاعر عبدالملک کے مولود نامے کا

تعارف زور مرحوم نے وضاحتی فہرست میں کرایا ہے۔ شاعر اپنی تصنیف کے ماخذ و مراجع احادیثِ نبوی کو بتاتا ہے، لیکن بالاستیعاب پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ موضوع احادیث کے سوا یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی حال فتاحی کی "مفید الیقین" کا ہے۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت بعثت اور معجزات منظوم کیے گئے ہیں۔ شاعر نے ان تمام روایات کو اس میلاد نامے میں شامل کر لیا ہے جن کا استعمال عموماً میلاد ناموں میں مستحسن قرار دیا جاتا ہے، مثلاً حضرت آمنہ کو ایام حمل میں خوابوں کا دکھائی دینا اور نو ماہ تک متواتر نو پیغمبروں کا بشارت دینا وغیرہ اغلب ہے کہ یہ عقیدت میں غلو اور اسرائیلی اساطیر کا تتبع ہو۔ بہرکیف فتاحی کی "مفید الیقین" عجیب و غریب واقعات سے پُر ہے۔ مولانا شبلی نے سیرت النبی میں ایسی تمام موضوع، ضعیف روایات پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور ان کے وضع و ضعف پر سے پردہ ہٹا دیا ہے۔

مولودِ رسول پر دکنی شاعر مختار نے بھی ایک رسالہ ترتیب دیا تھا۔ صحت روایات کے اعتبار سے اگرچہ اس میں بھی ضعف ہے لیکن شعریت سے بھرپور ہے۔ مختار کی یہ مثنوی تقریباً ۲۷۰۰ اشعار پر محیط ہے۔ اسے مجلس میلاد میں ترنم سے پڑھا جا سکتا ہے۔ معجزات کے بیان میں مختار نے چند بیانات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر دیے ہیں۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے مختار نے یہ کہلوا دیا کہ "میری وجہ سے ابراہیم نے نارِ نمرود سے خلاصی پائی تھی"۔ "نوح طوفان سے محفوظ رہے تھے"۔ وغیرہ۔ مختار نے "معجزہ شق القمر"، "شہادت الحجر"، "انگشت مبارک سے پانی کا نکلنا" وغیرہ کئی روایات صحیحہ بھی تفصیل سے نظم کیے ہیں۔

شعرائے قدیم میں گودھرا (گجرات) کے شاعر امین کے "تولد نامہ" میں بھی ولادتِ رسول کا ذکر ہے۔ یہ ڈھائی ہزار اشعار کی مثنوی شاعر کی کہنہ مشقی کا

پتہ دیتی ہے، لیکن جہاں تک مذہبی حیثیت کا تعلق ہے تو بقول ظہیر الدین مدنی "اس میں بہت غلط بیانی پائی جاتی ہے"۔[۵۳] اور پروفیسر نجیب اشرف نے صاف صاف کہہ دیا ہے۔

"تولد نامہ اپنے عہد کی اس موضوع کی مثنویوں میں متعدد حیثیت سے اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ولادت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں جو واقعات بیان کیے ہیں وہ بڑی حد تک کرشن جی کی ولادت کے حالات کا آئینہ معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت خدیجہ کی ابتدائی زندگی اور شادی سے متعلق بھی عجیب و غریب روایتیں بیان کی ہیں"۔[۵۴]

دکن کے ایک شاعر غواصی نے "قصص الانبیاء" کے عنوان سے تین دفتروں پر مشتمل ایک طویل مثنوی لکھی ہے، جس میں پیغمبروں کی سیرت اور حالات و کوائف بیان کیے ہیں۔ غواصی نے اس مثنوی کے تیسرے دفتر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، بعثت، معجزات وغیرہ کو نہایت تفصیل سے نظم کیا ہے۔ غواصی واقعات کو مسلسل اشعار میں گوندھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اسی لیے اتنی طویل مثنوی کے تینوں دفتروں میں باہم ربط دکھائی دیتا ہے اور واقعات یکے بعد دیگرے قاری کے سامنے ابھرتے چلے جاتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ منظوم کرنے میں شعرائے قدیم کے گل سر سبد محمد باقر آگاہ قادری بیجاپوری ثم ایلوری صف اول میں شمار ہوتے ہیں۔ "ھشت بہشت" جو منظوم سیرت پاک ہے، تقریباً ۹ ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔ اس کے ایک حصہ "من موہن" میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا ذکر مبارک ہوا ہے۔ شاعر نے اسلامی روایات کے ساتھ اسرائیلی اساطیر کا بھی سہارا لیا ہے۔ لیکن ان کے برتنے میں وہ حد درجہ محتاط نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے دیگر

شعرائے کرام کی بہ نسبت ان کے یہاں تاریخی حقائق اور احادیث و نصوص کی وافر مقدار نظر آتی ہے۔ اگرچہ بعض جگہ سہو و تسامح کی مثالیں بھی ملتی ہیں لیکن شاعر نے عوامی اعتقادات اور غلط مذہبی رجحانات کے پیش نظر ان کو اپنایا ہے۔ مثلاً استقرارِ حمل کا واقعہ بیان کرتے ہوئے آگاہ نے ایک مدرج بلکہ موضوع حدیث نقل کی ہے کہ "اسی شب فرشتوں نے شیطان کو مع اپنے تخت کے دریا میں ڈال دیا اور چالیس روز تک اس پر عذاب مسلط کیا گیا۔ اس کے ساتھیوں کے استفسار پر اس نے کہا کہ آج کی شب آمنہؓ کے شکم میں محمدؐ کا حمل قرار پایا ہے۔ جو خاتم المرسلین ہوں گے اور اولین و آخرین میں سب سے بہتر بھی" مثنوی میں بعض جگہ تاریخی سقم بھی در آئے ہیں مثلاً۔

نو مہینے ہوئے ہیں پورے جب — آمنہؓ کے اوپر بغیر تعب
بارویں کو ربیع کی اے یار — صبح کوں پیر کے بوقت بہار
جب ہوئے اصحاب فیل سب ویراں — بعد پنجاہ و پنج روز ازاں
چھ سو اوپر ہوئے تھے تیس برس — وقت عیسیٰ سے جب اے پاک نفس

. . . .

جان جاں و جہاں ہوا پیدا — شاہ کون و مکاں ہوا پیدا

یہاں آپؐ کی ولادت ۱۲ ربیع الاول ۶۳۰ء واقعہ فیل کے ۵۵ دن بعد بتائی گئی ہے جبکہ مورخین اسلام آپؐ کی ولادت باسعادت عام الفیل کے ۵۰ دن بعد ۵۷۱ء کو مانتے ہیں اور اسی پر اکثریت کا اتفاق ہے۔ معجزات کے بیان میں باقر آگاہ نے علامہ سیوطیؒ کی "رسائل مولود"، مولانا جامی کی "شواہد النبیؐ" اور عبدالحق دہلوی کی "معارج النبوۃ" وغیرہ سے استنباط کیا ہے۔

دکن ہی کے ایک غیر معروف شاعر سید حیات کی تصنیف "کتاب احوال النبیؐ" میں بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا ذکر ہے۔ کہتے ہیں ؎

جب آمنہؓ حاملہ ہوئی نور سے — گھر ہوا روشن زیادہ سور سے

. . . .

وقت آیا جب تولد کا قریب — یک تجلی نور کی ہوئی اے حبیب
صبح دم ظاہر ہوا وہ بے نظیر — تھی ربیع الاول کی دوسری روز پیر

آخری مصرع پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے "دوشنبہ" کا ترجمہ "دوسری روز" کر دیا۔ پھر ردیف اور قافیہ کی مناسبت سے "پیر" بھی لکھ دیا۔ جس کی وجہ سے اس مصرع کے معنی مبہم ہو گئے ہیں۔ اس کے مطابق تاریخ پیدائش ۲ ربیع الاول بروز پیر نکلتی ہے جو سراسر غلط ہے۔

ذوقؔ و غالبؔ کے معاصر سید عبدالمفتاح اشرفؔ کے دیوان "اشرف الاشعار" میں واقعہ میلاد النبیؐ پر کئی نظمیں ملتی ہیں۔ شاعر ذکر میلاد النبیؐ کو شعار اہل ایمان گردانتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ادب سے، آج ہوتا ہے یہاں مولد حضرتؐ — سنو اے دوستو! اب داستان مولد حضرتؐ
دوشنبہ بارہویں ماہ ربیع الاول کی تھی — طلوع آفتاب عز و شان مولد حضرتؐ
گرے نوشیرواں کے قصر کے چودہ منارے تب — پڑے بت اوندھے مکہ میں زمان مولد حضرتؐ
جھکا کعبہ طرف گھر آمنہؓ کا بار کوع ہو کر — قیامت تک رہا ہے باقی نشان مولد حضرتؐ

اشرفؔ نے تیسرے شعر میں تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب آپؐ کی ولادت ہوئی تو قیصر روم کے قصر کے کنگورے گر گئے تھے اور کعبۃ اللہ میں نصب بت

اوندھے منہ گر گئے تھے۔

امیر مینائی کی "صبح ازل" ولادت باسعادت حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان میں ایک اچھی مثنوی ہے۔ اگرچہ امیر نے فن نعت گوئی کو مستقلاً اختیار نہیں کیا، لیکن انکے کلام میں معتدبہ حصہ نعتیہ مضامین کا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق امیر کی نعتیہ شاعری کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"نعت کا جو طرز ہمارے اکثر شعراء نے اختیار کیا ہے وہ بہت ہی قابل اصلاح ہے ...... بھلا نعت میں زلف و کمر، خط و خال وغیرہ سے کیا تعلق ...... مانا کہ یہ بھی سہی، مگر یہ کیسی غضب کی بات ہے کہ جو مقصد نعت کا ہے اور جو نعت کی جان ہے وہ بالکل غائب۔ گو بعض اوقات منشی صاحب (امیر مینائی) بھی اسی ڈھرے پر چلے ہیں، مگر انھوں نے بہت اعتدال سے کام لیا ہے۔"[11]

بہرکیف "صبح ازل" میں جو مسدس میں لکھی گئی ہے شاعر نے خوشی و شادی کی منظرکشی کی ہے اور ولادت رسولؐ کے موقع پر شیاطین کے ماتم کدوں کا نقشہ بھی پیش کیا ہے۔

عقیدت کی ایسی شاعری میں امیر شعری محاسن کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ شاعر نے رسوم میلاد کو ذہن میں رکھکر ہی "صبح ازل" لکھی ہے اس لیے جابجا ان رسوم کا ذکر اس مثنوی میں ہوا ہے۔ مثلاً دوران ذکر مولود قیام کرنا ایک رسم بن گئی ہے۔ جو فخر دو عالمؐ کی آمد میں تعظیم کے لیے کھڑے ہونے کے مصداق ہے۔ شاعر کہتا ہے ؎

لو مومنو اب شاہ کی تعظیم کو اٹھو — محفل میں حضورؐ آتے ہیں تسلیم کو اٹھو
قربان کرو لاکے زر و سیم کو اٹھو — دیدار رخ احمد بے میم کو اٹھو

پھیلی ہے یہ ضو چار طرف رب علیٰ کی
تعظیم محمدؐ کی ہے تعظیم خدا کی[12]

شاعر نے اس مثنوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف "ارہاص" کا بھی ذکر کیا ہے، جو ولادت رسولؐ کے وقت ظہور پذیر ہوئے تھے۔

مولود مسعود کے ذکر میں الطاف حسین حالی کے مسدس کے چند شعر ہی عقیدت و شعریت کا نہایت اعلیٰ وارفع نمونہ نظر آتے ہیں۔ حالی نے ذکر مولود میں اپنی ایجاز پسندی سے اعجاز پیدا کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے مسدس کے یہ گنے چنے اشعار مستقل لکھے گئے بڑے بڑے میلاد ناموں پر بھاری ہیں۔ ان میں نہ خلاف شرع کوئی بات کہی گئی ہے اور نہ ہی مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے۔ پیرائے میں سادگی لیے ہوئے قرآن و احادیث اور دیگر آسمانی کتب کے حوالوں سے پُر یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

یکایک ہوئی غیرت حق کو حرکت — بڑھا جانب بوقبیس ابر رحمت
ادا خاک بطحانے کی وہ ودیعت — چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت

ہوئے پہلوئے آمنہؓ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا[13]

قرآن میں دعائے خلیلی کے الفاظ ہیں "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ" (سورۃ البقرہ ۱۲۹) حضرت عیسیٰؑ کی بشارت یوحنا کی انجیل میں بھی درج ہے اور قرآن کی سورہ الصف میں وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ (آیت ۶) کے الفاظ میں وارد ہے۔ ایک حدیث میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "میں اپنے دادا ابراہیمؑ کی دعا ہوں اور اپنے بھائی عیسیٰؑ کی بشارت ہوں"۔

حالی کے اس مسدس کے بعد "ذکر میلاد النبیؐ" کو موضوع سخن بنانے والوں میں سید وحید الدین سلیم (م ۱۹۲۸ء) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کی مولود بہاریہ "شعری محاسن

کا گویا مرقع ہے۔ اس نظم میں طویل بحر اور ہر مصرع میں "مستفعلن" کی آٹھ بار تکرار سے موسیقیت پیدا کی گئی ہے۔ سلیم نے موسم بہار سے تعلق رکھنے والے تمام پھولوں، پودوں اور موسم سے مناسبت رکھنے والی تمام اشیاء کا ذکر نہایت خوبی اور روانی کے ساتھ کیا ہے، اس طرح یہ نظم مصوری، شاعری اور موسیقی کا سنگم دکھائی دیتی ہے۔ نظم کا موضوع اگرچہ وہی ہے لیکن شاعر کے طرز بیان نے اس میں جدت اور نیا آہنگ پیدا کر دیا ہے۔

اے ہمدم شیریں سخن ہے نور حق پرتو فگن
ہر نخل گلی کی ہے پھبن طور جمال ذوالمنن
بن ٹھن عروسان چمن شیریں ادا شیریں بدن
رنگیں قبا گل پیرہن ہیں کس طرب سے خندہ زن
سہرا ایک پاسے ہے کھڑا کس درجہ ہے شرم وحیا
خاموش ہے سر کو جھکا یہ طرز کوئی سمجھے کیا
جب تک چلی باد صبا پتوں نے یہ کھولا پتا
کہتا ہے یہ صلے علیٰ اے مرحبا گہر زمن
نورِ قدم پیدا ہوا شاہ امم پیدا ہوا
عرشی خدم پیدا ہوا والا حشم پیدا ہوا
فرخ شیم پیدا ہوا بحر کرم پیدا ہوا
کوہ ہمم پیدا ہوا پیدا ہوا قدسی سخنؐ

"ولادت رسولؐ" کے واقعہ کو شاد عظیم آبادی نے بھی نظم کیا ہے۔ شاعر نے

البتہ شاعرانہ تخیلات سے زیادہ روایات پر زور دیا ہے۔ جیسا کہ پچھلے شعراء کے میلاد ناموں میں ہم دیکھ چکے ہیں۔

اردو ادب میں شاعری اور درویشی کا ہمیشہ چولی دامن کا تعلق رہا ہے صوفیا اور درویشوں نے عوامی لب ولہجہ میں دین کی باتیں لوگوں تک پہنچائیں۔ اس کے لیے کبھی تو انھوں نے قصہ کہانی کا سہارا لیا کبھی منطقیانہ اور فلسفیانہ طریقوں کو اپنایا اور کبھی عشق کا سہارا لیا کبھی رجز کا لیکن ایسی شاعری سے عوام مستفیض نہیں ہو سکتی تھیں اسلئے ان صوفیوں اور درویشوں نے عوامی گیتوں کا بھی سہارا لیا جو بالخصوص عورتوں میں مروج ہیں۔ مثلاً چکی نامہ، چرخی نامہ، جھولنا نامہ وغیرہ۔ یو۔پی کے ایک شاعر نور سہارنپوری کا "جھولنا نامہ" ملاحظہ کیجیے جس میں ذکر "میلاد" ہے۔

جھولتے جب نبی مصطفےٰ جھولنا جھوم کر کہتا صل علیٰ جھولنا
نوری پھولوں سے پھولا پھلا جھولنا جھوم کر کہتا صل علیٰ جھولنا

اور امجد حیدرآبادی کی نظم "نبی جی کی لوری" بھی سنیے۔

آمنہ بی بی کے گلشن میں آئی ہے تازہ بہار پڑھتے ہیں صلی اللہ وسلم آج در و دیوار
نبی جی! اللہ اللہ اللہ ھو لا الہ الا ھو

"عید میلاد النبیؐ" کے عنوان سے حفیظ جالندھری (م ۱۹۸۲ء) کی نظم بڑی پُراثر ہے۔ شاعر نے پرانی طرز کو اپناتے ہوئے پہلے دورِ جاہلیت کا نقشہ کھینچا ہے، پھر آپؐ کے آنے سے جو انقلاب رونما ہوا اس کی عکاسی کی ہے۔ شاعر نے استعارات وتشبیہات کے سہارے اپنے گلستانِ تخیل میں رنگ بھرا ہے۔ اسی طرح احسان دانش کی "نوائے کارگر" میں بھی ذکرِ میلاد کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ عمیق حنفی کی "صلصلۃ الجرس" میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت

باسعادت کا بیان اس طرح ہوا ہے۔

پردۂ مشرق کے پیچھے ہے فصل ربیع کی صبح امید — ہے پس مطلع حد ادب میں منتظر آمد خورشید
خانۂ زہرا میں داخل ہونے کو ہے خورشید بہار — دریا ایک قدم کا کیا ہے، میدان مریخ ہے پار
نام محمدؐ اس کے پہلے کس کو ملا یہ پیارا نام — صلی اللہ علیہ وسلم دونوں عالم بھیجیں سلام

ماہر القادری نے "آتے ہیں" کے عنوان سے لکھی نظم میں "میلاد النبیؐ" کا ذکر کیا ہے۔

جیسا کہ ابھی تک کی مثالوں سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ میلاد ناموں میں "وقت صبح" کی عکاسی بھی نہایت ماہرانہ انداز میں کی گئی ہے، ایسی ہی صبح کی عکاسی مراثی میں بھی کی گئی ہے۔ لیکن ان دونوں میں فرق ہے۔ مراثی کی صبح ہولناک ہے اور یہاں فرحت بخش۔ وہاں صبح کی آمد گرمی کی شدت کا احساس دلاتی ہے، یہاں موسم بہار کی نسیم کے جھونکے روح پرور اور کیف آگیں محسوس ہوتے ہیں۔ وہاں آفتاب صبح حدت کی علامت ہے اور یہاں صبح، آفتابِ رحمت لے آتی ہے۔ یہ صبح خوشگوار ہے اور وہ صبح دہشت ناک۔ یہ صبح درود و سلام سے گونجتی ہے اور وہ صبح نعرۂ تکبیر سے۔ یہ صبح معطر و مطہر ہے اور وہ صبح خون آلود۔ یہ صبح گوہر شبنم کی افشانی کرتی ہے اور وہ صبح آنسوؤں کے موتی کی۔ وہ صبح تلواروں کی جھنکار سے شروع ہوتی ہے اور یہ صبح طیوران خوش الحان کی زمزمہ خوانی سے۔ غرضکہ یہ صبح دعوت رحمت ہے اور وہ صبح دعوت کرب و بلا۔ اسطرح شعرائے اردو نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سعید کے واقعہ کو پیش کرنے میں عقیدت و محبت کے وہ گلستان کھلا دیے ہیں جنکی خوشبو ایمان افروز بھی ہے اور فرحت بخش بھی۔

مراجع

[1] عبداللہ عباس ندوی: عربی میں نعتیہ کلام لکھنؤ ۱۹۷۵ء ص ۳۰ [2] ایضاً [3] ڈاکٹر سید محی الدین زور: کلیات قلی قطب شاہ (مقدمہ) ص ۱۶۱ [4] ایضاً ص ۳۵ [5] ایضاً ص ۴۲ [6] عبداللہ قطب شاہ (مرتبہ سید محمد) دیوان عبداللہ قطب شاہ سلسلۂ یوسفیہ شمارہ ۹ ص ۳۱ [7] ظہیر الدین مدنی: "گجرات میں مذہبی مثنویات" مشمولہ "نوائے ادب" بمبئی شمارہ ۲ سنہ ۱۹۵۰ء ص ۱۵ [8] پروفیسر نجیب اشرف ندوی: "علی گڑھ تاریخ ادب اردو" علی گڑھ سنہ ۱۹۶۲ء ص ۱۲۹ [9] محمد باقر آگاہ: ہشت بہشت (من موہن قلمی) ادارۂ ادبیات حیدرآباد۔ ورق ۵ ب ۱۵ الف [10] سید حیات: کتاب احوال النبیؐ (قلمی) ادارۂ ادبیات ورق ۳۴ الف [11] سید عبدالفتاح اشرف: "دیوان اشرف الاشعار"، مطبع گلزار حسینی بمبئی ۱۲۸۵ھ ص ۲۶ [12] مولوی عبدالحق: "چند ہمعصر" علی گڑھ ۱۹۷۱ء ص ۹-۸ [13] امیر مینائی: "صبح ازل" حیدرآباد ۱۳۳۲ھ ص ۱۲ [14] الطاف حسین حالی: "کلیات نظم حالی: لاہور ۱۹۷۰ء جلد دوم ص ۷۳ [15] سید وحید الدین سلیم (مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل) "افکار سلیم" پانی پت ۱۹۳۸ء ص ۵۶ [16] نور سہارنپوری "دیوان نعت" سہارنپور ۱۹۳۹ء ص ۱۷-۱۶ [17] امجد حیدرآبادی (بحوالہ "تحفۂ محمدی) بحوالہ الیاس برنی لاہور ۱۹۴۸ء حصہ دوم ص ۲۲ [18] عمیق حنفی: "صلصلۃ الجرس" ص ۳۶۔

شاہ کلیم اللہ جہان آبادی اور ان کی تفسیر

قرآن القرآن بالبیان

از
محمد عارف اعظمی عمری، رفیق دارالمصنفین

چشتیہ سلسلہ کے مشائخ میں شاہ کلیم اللہ جہان آبادی کا نام بہت ممتاز ہے یہ سلسلہ حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کے بعد دہلی سے تقریباً معدوم ہو چکا تھا، مگر شاہ کلیم اللہ جہان آبادی کی بدولت نہ صرف یہاں از سر نو احیا ر ہوا بلکہ دکن، پنجاب، یوپی اور راجپوتانہ میں بھی اس کی خوب نشر و اشاعت ہوئی۔

نام و نسب اور خاندانی حالات شاہ صاحب کا نام کلیم اللہ اور ان کے پدر بزرگوار کا نام نور اللہ اور جد محترم کا احمد معمار تھا[1]، ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انکا خاندان خجند ہوتا ہوا لاہور پہنچا تھا۔[2]

۱؎ مناقب المحبوبین میں شیخ احمد کے والد شیخ حامد کا بھی تذکرہ ہے، مگر مولانا سید سلیمان ندوی کے خیال میں شیخ حامد شیخ احمد کے بھائی تھے، ملاحظہ ہو (مقالات سلیمان ج اول ص ۳۰۰ و ۳۰۱) پروفیسر نذیر احمد کی تازہ تحقیق کے مطابق شیخ احمد کے والد کا نام برخوردار تھا۔ ۲؎ مناقب المحبوبین میں ان کا اصل وطن خجند بتایا گیا ہے (ص ۴۵) شاہ صاحب کے ایک تایا لطف اللہ مہندس نے اپنی ایک کتاب منتخب الحساب کے دیباچہ میں یہ صراحت کی ہے کہ ان کے والد لاہور کے رہنے والے تھے، (مقالات سلیمان (بقیہ حاشیہ ص ۱۲۵ پر)

صاحب مناقب المحبوبین کے بیان کے مطابق اس خاندان کے لوگ شاہجہاں کے دور حکومت میں اس کے ایما سے لاہور چھوڑ کر دہلی میں آباد ہو گئے تھے[1] اور معماری کا پیشہ کرتے تھے۔

شاہ صاحب کے دادا شیخ احمد معمار اور ان کے بھائی شیخ حامد اپنے عہد کے بڑے باکمال عمارت گر اور نقشہ نویس تھے، شاہجہاں نے جب لال قلعہ کی تعمیر کا منصوبہ بنایا تو انہیں دونوں بھائیوں نے اس کا نقشہ بادشاہ کے روبرو رکھا جس کے موافق اس قلعہ کی تعمیر ہوئی[2] محمد صالح کنبوہ کے بیان کے مطابق یہ تعمیر شاہ صاحب کے دادا احمد معمار کی نگرانی میں ہوئی[3]۔ ان کا دوسرا اہم کارنامہ آگرہ میں ممتاز محل کے روضہ کی تعمیر ہے[4]۔ ان کے علاوہ عہد شاہجہانی کی دوسری عمارتیں بھی انھوں نے بنائی تھیں اور اسی بنا پر وہ معمار شاہجہانی بھی کہلاتے تھے[5]۔ ان تمام تعمیرات میں ان کے ساتھ ان کے بھائی استاد احمد اور ان کے لڑکے بھی شریک تھے۔ تاج محل کی تعمیر ۱۰۵۱ھ میں ختم ہوئی اور دہلی کا لال قلعہ ۱۰۴۸ھ سے شروع ہو کر ۱۰۵۸ھ میں تکمیل پایا۔ اس کے دوسرے سال ہی یعنی ۱۰۵۹ھ میں شیخ احمد کا انتقال ہوا[6]۔

۱۰۶۰ھ میں دہلی کی جامع مسجد کی تعمیر کے وقت شیخ احمد موجود نہ تھے اس لیے اس کو بنانے میں ان کے بھائی استاد احمد اور ان کے لڑکوں نے نمایاں حصہ لیا،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۴) ج اول ص ۳۱۷) مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس خاندان کے لاہور میں سکونت اختیار کرنے کی بیشمار دلیلیں تحریر کی ہیں۔ ملاحظہ ہو مقالات سلیمان ج ۱ ص ۲۹۶۔ ۳۲۱۔ ۳۲۷ اور ۳۳۰ تا ۳۳۳ ۱؎ مناقب المحبوبین ص ۴۵ ۲؎ تاریخ ہندوستان از مولوی ذکاء اللہ دہلوی جلد ۷ ص ۴۰۰ ۳؎ عمل صالح جلد سوم ص ۴۹۶ (اردو ترجمہ) ۴؎ مقالات سلیمان جلد اول ص ۳۰۰ بحوالہ دیوان مہندس ۵؎ ایضاً ص ۳۱۱ ۶؎ ایضاً ص ۳۰۰۔

کہا جاتا ہے کہ استاد حامد کا دوسرا شریک استاد ہیرا تھا[1] مسجد میں بیرونی محرابوں کے اوپر کی دیوار میں مسجد کے بنائے جانے کی جو تاریخ طویل فارسی عبارت میں بخط نسخ تحریر ہے وہ شاہ کلیم اللہ جہان آبادی کے پدر بزرگوار اور شیخ احمد کے فرزند حاجی نور اللہ کی باکمال انگلیوں کا اعجاز ہے۔ اس کتبہ کے آخر میں بسمت شمال "کتبہ نور اللہ احمد" لکھا ہوا ہے[2]

شاہ صاحب کے والد تین بھائی تھے جن کے نام یہ ہیں:۔

(۱) عطاء اللہ رشیدی نادر العصر (۲) لطف اللہ مہندس (۳) نور اللہ معمار۔

یہ تینوں بھائی ہندسہ اور عمارت گری کے فن میں مہارت رکھتے تھے اور نور اللہ کو جو سب سے چھوٹے تھے اس فن میں اس درجہ کمال تھا کہ معمار کا موروثی لقب صرف انھیں کو ملا، انہیں نظم و نثر میں بھی درک تھا۔

غرض پورا خاندان فن عمارت گری میں نمایاں اور ممتاز تھا اور اسی کے ساتھ علم و فن سے بھی بہرہ ور تھا[3]۔ شاہ صاحب کے والد ماجد درجہ خلیق اور طنساز بھی تھے۔ ان کی شادی شاہی دربار کے ایک متوسل مولوی احمد علی کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے یہ بدر منیر طلوع ہوا۔

ولادت | شاہ کلیم اللہ کی ولادت ۲۴ جمادی الثانی سنہ ۱۰۶۰ھ / ۲۴ جون سنہ ۱۶۵۰ء کو شاہجہاں آباد (دہلی) میں ہوئی اور اسی لیے وہ شاہجہاں آبادی کہلائے۔

---

[1] مقالات سلیمان جلد اول ص ۳۰۱ بحوالہ دیوان مہندس [2] مقالات سلیمان جلد اول ص ۳۰۶

[3] مزید تفصیل کے لیے علامہ سید سلیمان ندوی کا محققانہ مضمون "تاج محل اور لال قلعہ کے معمار" دیکھیے

مقالات سلیمان ج ۱ اول

تعلیم و تربیت | شاہ صاحب ایک صاحب کمالات خانوادہ کے چشم و چراغ تھے اور خود ان کی تعلیم و تربیت پر بھی خاص توجہ دی گئی، علاوہ ازیں انھوں نے بھی بڑی محنت اور جانفشانی سے حصول علم کیا[1] ان کے اساتذہ میں شیخ برہان الدین المعروف بہ شیخ بہلول اور شیخ ابو الرضا، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے والد بزرگوار کے برادر کلاں تھے۔ اسطرح شاہ کلیم اللہ علوم شریعت میں فاضل یگانہ بن گئے

حلقۂ درس | تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے چند برس مطالعہ میں گزارے اور اس دوران میں انھوں نے بعض درسی کتابوں پر شروح حواشی لکھے۔ پھر اپنے پدر بزرگوار حاجی نور اللہ کے حکم کی تعمیل میں زینت المساجد دہلی کے دالان میں باقاعدہ درس دینا شروع کیا۔ جس کا سلسلہ تقریباً آٹھ سال تک جاری رہا اور اس دوران بے شمار تشنگان علم نے اپنی پیاس بجھائی۔

تصوف و سلوک | درس و تدریس کے زمانہ میں شاہ صاحب کی ملاقات ایک مرد عارف سے ہوئی۔ اس کے اثر سے وہ معلمی کا مشغلہ ترک کر کے معرفت و سلوک کی راہ پر گامزن ہو گئے، جس میں بڑی مشقت و ریاضت کی۔ بالآخر دہلی کے ایک بزرگ حضرت محمد صادق خلیفہ میاں پیر محمد سلونی کی خدمت میں حاضری دینے لگے۔ شیخ محمد صادق نے شاہ کلیم اللہ کی طلب صادق دیکھی تو ان کو مشورہ دیا کہ وہ مزید حصول معرفت کے لیے مدینہ منورہ شیخ یحییٰ مدنی کے پاس جائیں۔

شیخ یحییٰ مدنی | شیخ یحییٰ مدنی اپنے زمانے کے مشاہیر صوفیہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ وہ علامہ شیخ کمال الدین کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ولادت بیس رمضان

---

[1] تکملہ سیر الاولیاء ص ۹۷۔

سنہ [illegible]ھ کو احمد آباد (گجرات) میں ہوئی۔ نو عمری ہی میں تکمیل علوم کے بعد سجادہ مشیخت پر سرفراز ہوئے، شاہ و گدا سب ان سے عقیدت رکھتے تھے، خود اورنگ زیب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، بعد میں شیخ یحییٰ مدنی ہجرت کر کے مدینہ منورہ چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی اور ۲۸ صفر سنہ ۱۱۰۱ھ کو اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

سفر حجاز | علامہ علی آزاد بلگرامی کے بیان کے مطابق شاہ کلیم اللہ ہندوستان میں علوم سے فراغت کے بعد حجاز تشریف لے گئے تھے[1] مگر دوسرے ماخذ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ شیخ محمد صادق کے مشوروں سے مدینہ کے سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ شیخ یحییٰ مدنی کی ملاقات اور مدینہ کی روانگی کا شوق ایسا دامن گیر ہوا کہ اپنی والدہ ماجدہ سے اسکی اجازت بھی نہ لے سکے جو اس وقت زندہ تھیں[2]

شاہ صاحب پہلے مکہ معظمہ پہونچے۔ اور حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے[3] یہاں کی مقدس جگہوں کی زیارت کرنے کے بعد مدینہ منورہ شیخ یحییٰ مدنی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ مدینہ طیبہ میں انھوں نے طویل عرصہ تک قیام کیا اور شیخ یحییٰ مدنی کے علاوہ دوسرے بزرگوں سے بھی کسب فیض کیا[4] ان کا نام میر محترم اور شیخ محمد غیاث تھا، اول الذکر سے شاہ صاحب نے نقشبندی طریقہ کی سند و اجازت حاصل کی اور شیخ محمد غیاث سے قادری سلسلہ میں نسبت حاصل کی[5]

مراجعت وطن | سرزمین حجاز میں علم و معرفت کے حصول کے بعد شاہ صاحب دہلی واپس ہوئے اور جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان بازار خانم میں سکونت پذیر ہوئے، جو

---

[1] ماثر الکرام دفتر اول ص ۲۴۴ [2] تکملہ سیر الاولیا ص ۹، [3] نزہتہ الخواطر جلد ۶ ص ۲۴۰ [4] ماثر الکرام جلد اول ص ۲۴۴ [5] نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۲۴۰-۲۴۱

اس وقت دلی کا سب سے زیادہ بارونق بازار تھا۔ تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ یہ جگہ ان کے خاندان کو شاہجہاں نے عطا کی تھی کیونکہ لال قلعہ اور جامع مسجد کے معماروں کے لیے وہی موزوں ترین جگہ تھی۔ علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ:

"دہلی کے ایک قدیم معزز خاندان کے ایک واقف کار (سید مرتضیٰ علی صاحب ہیڈ کلرک دفتر کمانڈر انچیف دہلی) کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ استاد حامد اور استاد احمد (جد شاہ کلیم اللہ) دونوں بھائی تھے۔ استاد حامد کے نام سے کوچہ "استاد حامد" دہلی میں اب تک دریبہ اور جامع مسجد کے درمیان موجود ہے اور ان کی اولاد دہلی میں سکونت پذیر ہے اور لاہور والے کہلاتے ہیں اور آج کل وہ سادہ کاری کا کام کرتے ہیں"[1]

اپنے اسی مسکن میں انھوں نے پھر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ جسکی شہرت بہت جلد اکناف ملک میں پھیل گئی اور دور دور سے طلبہ تحصیل علم کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے، یہ تمام طلبہ شاہ صاحب کے یہاں مقیم رہ کر اپنے اپنے اسباق پڑھتے تھے اور ان کو کپڑا اور کھانا حکومت مہیا کرتی تھی[2]

شاہ کلیم اللہ علم ظاہر و علم باطن دونوں کے جامع تھے اس لیے جو طلبہ علم ظاہر کی تحصیل کے لیے آتے تھے ان میں سے بعض علم باطن سے بھی مالا مال ہوتے۔ شاہ صاحب کو درس حدیث سے خاص شغف تھا، حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ ایک مرتبہ ان سے ملنے کے لیے آئے تو دیکھا کہ وہ صحیح بخاریؒ کے درس میں مشغول ہیں[3]

دعوت و ارشاد | شاہ کلیم اللہ جب دہلی میں مسند علم پر جلوہ افروز ہوئے اس وقت

---

[1] مقالات سلیمان ج اول ص ۳۰۱ [2] انوار العارفین ص ۴۳۰ [3] ایضاً۔

اورنگ زیب عالم گیر کی حکومت کا آخری دور تھا اور وہ خود اور اس کے اہل خاندان نیز فوج کا بیشتر حصہ دکن میں بغاوتیں فرو کرنے میں مصروف تھا، اس طرح ملک کے سیاسی حالات کی طرح مذہبی و اخلاقی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ ان حالات میں شاہ کلیم اللہ نے رشد و اصلاح کے کام کی ذمہ داری سنبھالی[1] اور اپنے باکمال خلفاء کو مختلف مقامات پر اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے روانہ فرمایا، جن میں سرفہرست ان کے عزیز ترین مرید شیخ نظام الدین تھے۔ جن کو اس کام کے لیے دکن روانہ فرمایا تھا، یہ شاہی لشکر کے ہمراہ دکن گئے اور کچھ عرصہ دکن میں ان کی نقل و حرکت لشکر ہی کے ساتھ ہوتی رہی، انکی تبلیغی کوششوں کے نتیجہ میں لشکر کے لوگ ان کے گرویدہ ہو گئے۔ بیجاپور اور برہانپور میں بھی ان کا قیام رہا۔ آخر میں اورنگ آباد جا کر مستقل مقیم ہو گئے اور وہاں خانقاہ نظامیہ قائم کی۔

شاہ صاحب کے تربیتی خطوط

شاہ صاحب اپنے خلفاء کو برابر تربیتی ہدایت نامے جاری فرمایا کرتے تھے، جن کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے ابتر معاشرتی حالات سے حد درجہ کبیدہ خاطر تھے، اس لیے وہ برابر اپنے خلفاء کو دعوت دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کی تلقین کرتے۔ چنانچہ اپنے عزیز خلیفہ شیخ نظام الدین کو لکھتے ہیں:

"تم کو اللہ تعالیٰ نے دکن کی ولایت عطا فرمائی ہے، تم یہ کام پورے طور پر انجام دو میں نے اس سے پہلے تم کو لکھا تھا کہ لشکر میں جاؤ، لیکن اب یہ حکم ہے کہ جہاں کہیں ہو اعلائے کلمۃ الحق میں مصروف رہو اور اپنے جان و مال کو اسی میں ہی صرف کر دو۔"[2]

شاہ صاحب لوگوں کی مادیت پسندی دیکھ کر بہت رنجیدہ رہتے تھے، چنانچہ

[1] مقدمہ مکتوبات [2] مکتوبات کلیمی ص ۲۶ مکتوب (۲۱)

لکھتے ہیں:

"بندگان خدا کے دل سے دنیا کی محبت ختم کر دینا چاہیے[1]...... اے دوست! دنیا نفس پروری اور تن آسانی کی جگہ نہیں[2]"

اشاعت اسلام

شاہ صاحب اشاعت اسلام کے فرض سے بھی غافل نہیں تھے، وہ اپنے مریدوں کو بھی اس کے لیے کمربستہ ہو جانے کی دعوت دیتے تھے۔ ایک مرتبہ شیخ نظام الدین نے ایک شخص کے لیے خلافت کی سفارش کی تو فرمایا:

"جب تک اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کمر ہمت نہ باندھی جائے خلافت سے کیا فائدہ[3] ... دینی و دنیاوی فیض دنیا کو پہونچاؤ، اپنا عیش و آرام لوگوں پر قربان کر دو[4] ... ہر حال میں اعلاء کلمۃ الحق کے لیے کوشش کرتے رہو اور اسلام کی آواز مشرق مغرب تک پہنچا دو[5]... اعلاء کلمۃ الحق میں کوشش کرتے رہو اور اس کام کو معمولی خیال مت کرو، کیونکہ خدا اسی کام سے خوش ہوگا، لوگوں کی اصلاح میں لگے رہو، انبیاء علیہم السلام بھی اسی کام کے لیے مبعوث ہوئے تھے[6]"

ایک مکتوب میں اپنے مرید محمد علی کو لکھتے ہیں:

"اعلاء کلمۃ الحق ہمارے پیروں کا مسلک ہے، تم بھی اس میں کوشش کرتے رہو[7]"

اور اپنے تمام مریدین کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

"اسلام کی اشاعت میں خوب کوشش کرو[8]"

شاہ صاحب کی رہنمائی اور توجہ اور ان کے خلفاء کی سعی و محنت سے بہت سے

[1] مکتوبات کلیمی ص ۱۹ مکتوب (۱۳) [2] ایضاً ص ۵۹ مکتوب (۴۲) [3] ایضاً ص ۳۹ مکتوب (۳۹) [4] ایضاً ص ۶۰ مکتوب (۴۵) [5] ایضاً ص ۶۲ مکتوب (۵۰) [6] ایضاً [7] ایضاً ص ۸۰ مکتوب (۱۱۵) [8] ایضاً ص ۷۰ مکتوب (۷۶)

غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔ شیخ نظام الدین کی تبلیغ و تلقین سے دکن میں کئی غیر مسلم خاندان مسلمان ہوئے[1] اس کی اطلاع جب شاہ صاحب کو ہوئی تو بہت مسرور ہوئے اور شیخ نظام الدین کو تحریر فرمایا :

" بہر حال مقصد دنیا والوں کو فیض محمدی پہونچانا ہے۔ یہ کام جس طرح بھی ہو سکے سر انجام دینا چاہیے"[2]

نومسلموں میں بعض اسلام کے اظہار و اعلان میں تامل کرتے تھے، اس کی اطلاع جب شاہ صاحب کو ہوئی تو شیخ نظام الدین کو لکھا :

" میرے بھائی اس بات کی کوشش کرو کہ آہستہ آہستہ یہ بات ہو جائے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام کو مخفی نہ رکھا جائے، ایسا نہ ہو کہ مرنے کے بعد لوگ ان سے وہ معاملہ کر بیٹھیں جو غیر مسلموں کے ساتھ کیا جاتا ہے"[3]

غرض شاہ صاحب نے اس پر آشوب دور میں دعوت و اصلاح کے فریضہ کو درد مندی اور دلسوزی کے ساتھ انجام دیا اور یہ سلسلہ ان کے بعد انکے تلامذہ و مریدین نے بھی جاری رکھا۔

طریقۂ تربیت شاہ کلیم اللہ نے اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت کا بھی بہتر انتظام کیا تھا، وہ ان کے اعمال و اشغال اور اخلاق و اطوار کی مکمل نگرانی کرتے تھے اور دہلی میں رہنے کے باوجود ان تمام خلفاء سے باخبر رہتے تھے جو بیرون دہلی دعوتی اور تبلیغی کام پر مامور تھے ان کی معمولی کوتاہیوں پر ان کو متنبہ فرماتے تھے۔ سب کو تاکید کر رکھی تھی کہ وہ ان کو اپنے حالات سے مطلع کرتے رہیں۔ چنانچہ ان کے تمام مریدین اس کی پابندی کرتے تھے۔ اور ان کی اجازت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ وقت کی پابندی پر خاص طور پر

---

[1] حیات کلیم ص ۴۸ [2] مکتوب (۴۰) [3] ایضاً ص ۸۱ مکتوب (۲۱)۔

زور دیتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ :

" جو شخص وقت کا پابند نہیں وہ خسر الدنیا والآخرۃ کے مصداق ہے"[1]

وہ اپنے مریدوں کو تساہل اور تن آسانی سے بھی باز رکھتے تھے ارشاد فرماتے ہیں :

" تم اپنے کام میں اور زیادہ سرگرم ہو جاؤ یہاں تک کہ جو شخص تمھارے پاس پہونچے وہ بھی تمھارا کام کرنے لگے"[2]

وہ اپنے خلفاء کو اپنے سلسلہ کی اشاعت کی بھی تلقین کرتے تھے تاکہ یہ سلسلہ رشد و اصلاح آیندہ بھی جاری رہے۔

اتباع شریعت کی تاکید شاہ صاحب برابر اپنے تمام مریدین و خلفاء کو اتباع شریعت کی تلقین فرماتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ شریعت کو نظر انداز کر کے کسی شخص کو روحانی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی، ایک مکتوب میں اپنے خلیفہ شیخ نظام الدین کو تحریر فرماتے ہیں :

" سب داخل سلسلہ لوگوں کو تاکید کرنی چاہیے کہ ظاہر کو شریعت سے آراستہ اور باطن کو عشق مولی سے پیراستہ رکھیں"[3]

ایک مکتوب میں رقمطراز ہیں :

" اے بھائی اگر کسی فقیر کا درجہ و مرتبہ معلوم کرنا چاہو تو دیکھو کہ وہ شریعت کا کس حد تک پابند ہے، فقیر کی شناخت کا معیار شریعت ہی ہے، اسی کسوٹی پر کھرے کھوٹے کو پہچانا جا سکتا ہے"[4]

شاہ صاحب شریعت پر عمل نہ کرنے والے اصحاب طریقت کو گمراہ بتاتے ہیں :

---

[1] مکتوبات کلیمی (۲۲) [2] ایضاً مکتوب (۶۴) [3] ایضاً مکتوب (۱۳) و (۴۷)، [4] ایضاً مکتوب

"جو شخص شریعت میں راسخ نہیں وہ ناقص ہے، اس کے بغیر اس کی طریقت و حقیقت کا اثاثہ بے قیمت ہے، مرد کامل وہ ہے جو شریعت، طریقت اور حقیقت تینوں کا جامع ہو"[1]

شاہ صاحب نے گمراہ صوفیہ کی سخت مذمت بھی کی ہے۔

وفات شاہ صاحب کو اخیر عمر میں نقرس اور وجع المفاصل کے امراض لاحق ہو گئے تھے[2] بالآخر اسی مرض میں ان کا انتقال ہوا اور اپنی مسکونہ حویلی ہی میں مدفون ہوئے[3]۔ ان کی تاریخ وفات ۲۴ ربیع الاول ہے، البتہ سن وفات میں اختلاف ہے، صاحب نزہتہ الخواطر نے ۱۱۴۱ھ میں ان کی وفات بتائی ہے[4]۔ اس کی تائید ان کے ایک مرید کی اس تاریخ وفات سے بھی وفات ہوتی ہے :۔

کلیم اللہ عارف صاف بودہ	باقلیم بقا شوقش ربودہ
پرسیدم چو تاریخ وفاتش	خرد گفتا کہ ذات پاک بودہ[5]

۱۱۴۱

اس کے برخلاف آزاد بلگرامی نے شاہ صاحب کا سال وفات ۱۱۴۳ھ بتایا ہے۔ جو ان کے مزار پر کندہ بھی ہے۔

فضل و کمال خویش بود	مرہم قلب ریش بود
سال وفاتش گفتہ ہاتف	قطب زمانہ خویش بود[6]

۱۱۴۳

اولاد شاہ کلیم اللہ کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں، بچوں کے نام خواجہ محمد[1]، حامد سعید[2]، محمد فضل اللہ[3]، اور محمد احسان اللہ[4] تھے اور بچیوں کے نام یہ تھے، بی بی رابعہ[1]، بی بی فخر النساء[2] اور زینب بی بی مصری کے نام سے مشہور تھیں۔ ان میں خواجہ محمد شاہ صاحب

---

[1] مکتوبات کلیمی [2] مکتوب (۱۲۵) [3] مآثر الکرام ج اول ص ۴۳ [4] نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۲۴۱
[5] شجرۃ الانوار قلمی بحوالہ تاریخ مشائخ چشت ص ۴۲۱ [6] مآثر الکرام ج اول ص ۳۴۔

کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے اور بقیہ اولاد انکے بعد بھی زندہ رہیں۔

اخلاق و عادات شاہ کلیم اللہ ایک متواضع خلیق سادگی پسند، متحمل مزاج اور حلیم الطبع بزرگ تھے، وہ دشمنوں اور مخالفوں سے بھی کبھی ناراض نہیں ہوئے ان سے انتقام لینا تو درکنار، ہمیشہ ان کے لیے دعا گو رہتے اکثر انکی زبان پر یہ اشعار جاری رہتے[1]

ہر کہ مارا رنجہ دارد راحتش بسیار باد	ہر کہ مارا یار نبود ایزد اورا یار باد
ہم کو تکلیف پہنچانے والے کو بہت راحت نصیب ہو	اور جو کوئی ہمارا دوست نہ بنے خدا اسکا دوست بنے
ہر کہ خارے بر نہد در راہ ما از دشمنی	ہر گلے کز باغ عمرش بشگفد بے خار باد
جو شخص دشمنی کی نیت سے ہماری راہ میں کانٹے بچھائے	اس کے باغ عمر کا ہر پھول بے خار کھلے

شاہ کلیم اللہ اپنے مریدوں کو بھی اس کی تلقین فرماتے تھے کہ وہ لوگوں کی جفا اور درشتی کو برداشت کریں، ان کا کہنا تھا کہ ہمارا کام دلوں کو جوڑنا ہے، اس راہ میں جتنی بھی مشکلات پیش آئیں ان کو خندہ پیشانی سے انگیز کرنا چاہیے، دکن میں ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے انکی مذمت کی جس سے ان کے شاگرد عزیز شیخ نظام الدین کو دکھ ہوا اور انھوں نے اس کی اطلاع شاہ صاحب کو بھی دی، تو اس کے جواب میں انکو لکھا۔

"کوئی شخص ہم کو برائی سے یاد کرتا ہے تو اس میں کیا مضائقہ ہم تو اس سے برے کے جانے کے مستحق ہیں یہ تو اس کا لطف و کرم ہے کہ اس نے ہمیں کم برا بھلا کہا۔ ہم نے اس کو معاف کیا تم بھی اسے معاف کر دو"[2]

استغنا و بے نیازی شاہ کلیم اللہ بڑے غیور اور بارعب بھی تھے، اپنے مکان کا ایک حصہ کرایہ پر دے رکھا تھا، اسی معمولی رقم پر گزر اوقات کرتے، جس کی بنا پر وہ

---

[1] بحوالہ مکتوبات [2] ایضاً۔

مقروض بھی ہو جاتے تھے، مگر کسی کے آگے دست سوال دراز کرنا گوارا نہیں تھا۔ وہ امراء اور سلاطین کے ہدیے اور تحفے بھی قبول نہیں کرتے تھے، فرخ سیر نے شاہ صاحب کی کئی مرتبہ مالی مدد کرنی چاہی مگر انھوں نے اسے لینے سے انکار کر دیا، اس نے انکی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہی تو کہلا بھیجا کہ یہ بات ہمارے لیے اذیت کا موجب ہوگی، شاہ صاحب جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے جب مسجد جاتے تو وہاں بادشاہ بھی ہوتا تھا مگر اجازت کے بغیر بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی[1]

تصنیفات شاہ کلیم اللہ نے متعدد مفید اور اہم کتابیں یادگار چھوڑیں جن کی تعداد بتیس[۳۲] بتائی گئی ہے[2] لیکن ان میں سے اکثر معدوم ہیں، تاہم جن کتابوں کا سراغ ملتا ہے وہ بھی ان کی عظمت و جلالت اور علمی تبحر کا ثبوت ہیں، ذیل میں ان کا مختصر تعارف درج ہے۔

۱۔ **عشرہ کاملہ** :۔ اس کتاب کا موضوع تصوف ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں تصوف کے دس مسائل کی تشریح کی گئی ہے، یہ کتاب بھی عربی میں ہے اور چھپ چکی ہے۔

۲۔ **سواء السبیل** :۔ اس کا موضوع بھی تصوف ہے اور یہ بھی عربی زبان میں ہے، اس کا ایک عمدہ نسخہ رام پور کے کتب خانہ میں ہے۔ حیات کلیم کے مرتب نے اس کے بعض اقتباسات کا اردو ترجمہ کیا ہے، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب علمی انداز میں لکھی گئی ہے اور اس میں عقائد اور تصوف کے دقیق علمی مباحث پر گفتگو کی گئی ہے۔

---

[1] بحوالہ تکملۃ سیر الاولیاء [2] مناقب فریدی ص ۴۳۔

۳۔ **کشکول** :۔ شاہ کلیم اللہ کی اس فارسی تصنیف کو ان کی سب سے مشہور و مقبول کتاب خیال کیا جاتا ہے جو تصوف کے اسرار و رموز پر مشتمل ہے یہ سلسلہ میں بعض احباب کی فرمائش پر لکھی گئی تھی، اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ متاخرین صوفیہ اپنے مریدین کو خرقہ خلافت کے ساتھ یہ کتاب بھی دیتے تھے اور خود شاہ صاحب بھی اس کے مفید ہونے کی بنا پر اپنے خاص مریدوں کو اس کے مطالعہ کی ہدایت فرماتے تھے، یہ کتاب طبع ہو چکی ہے اور اس کا سلیس اردو ترجمہ بھی حیات کلیم کے مولف نے کیا ہے جو انکی کتاب میں شامل ہے[1]۔

۴۔ **مرقع** :۔ یہ کتاب بھی فارسی زبان میں ہے اور اس کی حیثیت کشکول کے ضمیمہ کی سی ہے، خرقۂ خلافت دیتے وقت کشکول کی طرح اسے بھی اپنے خلفا کو دینا صوفیائے متاخرین کا معمول تھا۔ یہ کتاب بھی طبع ہو چکی ہے اور اس کا بھی اردو ترجمہ حیات کلیم میں موجود ہے[2]۔

۵۔ **تسنیم** :۔ اس کا موضوع بھی تصوف ہے اور یہ بھی صوفیہ کے حلقہ میں بہت مقبول تھی، قاضی محمد عاقل والہانہ انداز میں اس کا درس دیا کرتے تھے ان کے ایک مرید مولانا عبداللہ نے اس کی شرح بھی لکھی تھی[3] مگر اب یہ کتاب دستیاب نہیں ہے۔

۶۔ **رسالہ تشریح الافلاک عاملی محشی بالفارسیۃ** :۔ یہ رسالہ علم ہیئت میں ہے جس کا مذاق شاہ صاحب کے خاندان میں عام تھا، اس کتاب کا ایک نادر نسخہ نذیریہ پبلک لائبریری دہلی میں موجود ہے[4]

---

[1] حیات کلیم ص ۱۰۳ تا ۱۰۸ [2] ایضاً ص ۱۹۵ تا ۲۲۶ [3] بحوالہ تکملہ سیر الاولیاء [4] تاریخ مشائخ چشت ص ۳۹۵۔

۷۔ **شرح القانون**:۔ یہ ابن سینا کی کتاب القانون کی شرح ہے اور اس کا واحد نسخہ رام پور کے کتب خانہ حامدیہ میں ہے[1]

۸۔ **مکتوبات**:۔ ان تصنیفات کے علاوہ شاہ کلیم اللہ کے ایکسو بتیس ۱۳۲ مکتوبات ہیں جو فارسی میں ہیں اور ان کا مجموعہ "مکتوبات کلیمی" کے نام سے ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء میں دہلی سے شایع ہوا ہے، اس مجموعہ میں سنتر ۷۰ سے زیادہ خطوط شیخ نظام الدین کے نام ہیں جو ان کو دکن بھیجے گئے تھے اور باقی دوسرے مریدوں کے نام ہیں اس سے شاہ صاحب کے عہد کے سیاسی و معاشرتی حالات کے علاوہ ان کی علمی اور دعوتی سرگرمیوں کا بھی پتہ چلتا ہے

۹۔ **ملفوظات**:۔ شاہ صاحب کے ملفوظات کا مجموعہ بھی تھا جس کو حیات کلیم کے مرتب نے اردو کا جامہ پہنایا ہے[2] ان کا اسلوب اور انداز بھی مکتوبات جیسا ہے۔

تذکروں میں مزید کتابوں کے نام بھی ملتے ہیں، جیسے الہامات کلیمی ۱۰، التکسیر ۱۱ رد روافض ۱۲ وغیرہ۔ علم منطق میں بھی ان کا ایک رسالہ ۱۳ تھا[3] جو اب نایاب ہے اردوئے معلیٰ میں حکیم سید احمد حسن مودودی کے نام اسد اللہ خاں غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب شعر بھی کہتے تھے اور ان کا مجموعۂ کلام بھی تھا جو غدر کی تباہیوں کی نذر ہوگیا۔

۱۴۔ **قرآن القرآن بالبیان**:۔ یہ شاہ صاحب کی سب سے اہم تصنیف ہے جو عربی زبان میں قرآن مجید کی مختصر تفسیر ہے، یہ جلالین کی ہم پایہ خیال کی جاتی ہے، مگر جلالین میں شافعی مسلک کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے اور یہ تفسیر حنفی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے، اس کے دو قلمی نسخے حیدرآباد کے کتب خانوں میں موجود ہیں پہلا کتب خانہ

[1] نزہتہ الخواطر ج ۶ ص ۲۴۱ [2] حیات کلیم ص ۹۶ تا ۱۰۶ [3] مناقب المحبوبین ص ۴۶۔

آصفیہ میں اور دوسرا عثمانیہ یونیورسٹی کی لائبریری میں ہے۔ اس کا ایک مکمل مخطوطہ کتب خانہ فاضلیہ گڑھی افغانان میں بھی بتایا جاتا ہے،

شاہ کلیم اللہ صاحب نے یہ تفسیر ۱۱۲۵ھ میں تالیف کی تھی دراصل قدیم اہم تفسیروں کی ایک جامع تلخیص ہے، چنانچہ وہ اس کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"یہ علمائے ملت حنفیہ بیضاء کی تفسیروں سے ماخوذ ہے، میں نے اس کا نام قرآن القرآن بالبیان" رکھا ہے، میں کلیم اللہ جہان آبادی مذہباً حنفی اور مشرباً صوفی ہوں، یہ تصنیف ۱۱۲۵ھ میں مکمل ہوئی"[1]

غالباً یہ تفسیر الگ سے نہیں شایع ہوئی ہے البتہ سنہ ۱۲۹۰ھ میں میرٹھ کے مطبع احباب سے شاہ رفیع الدین صاحب کے ترجمۂ قرآن پاک کے حواشی پر طبع ہوئی ہے، جس کے ساتھ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی کہی ہوئی یہ تاریخ بھی درج ہے۔

کار فرمائے مطبع احباب   شیخ عرفان حق جوان دبیر
اور مختار ہاشمی مطبع   کون ہاشم علی با تدبیر
چھاپا ہو کر کے جمع دونوں نے   ایسا مصحف نہیں ہے جسکی نظیر
بیچ میں ترجمہ ہے اور اوپر   ایک تفسیر کی نئی تحریر
وہ تو فیض شہ رفیع الدین   بحر مواج فیض خیر کثیر
اور یہ فیض شہ کلیم اللہ   تھے طریقت میں جو کہ بدر منیر
چھپ چکا جبکہ سب یہ حرز جاں   ہاتف غیب نے پئے تشہیر
کر کے آواز کو بلند کہا   چھپا قران بمعنی و تفسیر
۱۲۹۰ھ

مولانا قاسم صاحبؒ نے یہ تاریخ بھی نکالی تھی:

[1] دیباچۂ تفسیر۔

کیا خوب واہ کیا خوب ۱۲۹۰ھ   ختم المصاحف ۱۲۹۰ھ

کیا خوب چھاپا کیا خوب ۱۲۹۰ھ (بحوالہ تاریخ مشائخ چشت ص ۳۹۱ و ۳۹۲)

ماخذ اس تفسیر میں جن اہم قدیم تفسیروں سے مدد لی گئی ہے، شاہ صاحب کی وضاحت کے مطابق ان کے نام یہ ہیں۔ بیضاوی[1]، مدارک[2]، جلالین[3] اور تفسیر حسینی[4]۔

مجموعی حیثیت سے یہ اچھی اور بہتر تفسیر ہے، مفسر حنفی تھے اس لیے اس کے اثر سے خالی نہیں ہے، اس کی ترتیب جلالین کے انداز پر کی گئی ہے، لیکن اختصار کا یہ حال ہے کہ بعض جگہ صرف دو تین جملے اشارتاً لکھے گئے ہیں، سبب نزول کی وضاحت قدرے تفصیل سے کی گئی ہے، مسائل میں احادیث سے بھی استنباط کیا گیا ہے، البتہ الفاظ و لغات کی بحثیں کم ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ تفسیر ہماری نظر سے نہیں گزری ورنہ اس کی خصوصیات پر تفصیل سے بحث کی جاتی۔

قرآنیات پر دارالمصنفین کی کتابیں

ارض القرآن حصہ دوم:۔ (از مولانا سید سلیمان ندوی)

اس حصے میں قرآن مجید میں مذکور اقوام، مدین، اصحاب الایکہ، قوم ایوب، بنو اسمٰعیل، اصحاب الرس، اصحاب الحجر، انصار اور قریش کی تاریخ اور عرب کی تجارت، زبان اور مذہب پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۳۰ روپیے۔

مقالات سلیمان حصہ سوم:۔

اس حصے میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے قرآن مجید کے مختلف پہلوؤں پر مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ قیمت ۴۵ روپیے۔

"منیجر"

بہرائچ کے بعض صوفیہ کرام

از جناب معین احمد علوی

(۳)

۴۔ حضرت مولانا شاہ نعیم اللہ بہرائچی

خوش قسمتی سے شاہ نعیم اللہ صاحبؒ کے خاندانی کتب خانہ سے مولانا شاہ محمد اسلم صاحب مرحوم اور مکرمی اعزاز الحسن صاحب کی عنایات سے راقم الحروف کو مولانا کی ایک خود نوشت سوانح عمری استفادہ کرنے کو مل گئی جو اپنے برادر گرامی قدر بخش اللہ کے بار بار اصرار پر تحریر فرمائی تھی، اس مضمون میں اسی رسالہ کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

پیدائش مولانا شاہ نعیم اللہ کی پیدائش موضع بھدوانی پرگنہ فخرپور علاقہ گنڈارہ تحصیل قیصر گنج ضلع بہرائچ میں ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۹ء میں ہوئی۔ وہ نسباً علوی، مذہباً حنفی، مشرباً مجددی اور وطناً بہرائچی تھے۔ نسبی شجرہ اس طرح ہے۔

نعیم اللہ بن[1] غلام قطب الدین[2] عرف ملک کالے، بن ملک[3] غلام محمد، بن[4] ملک آدم، بن[5] ملک مبارک بن ملک[6] جلال، بن نصیر الدین[7]، بن ملک شیبت[8]، بن[9] ملک احمد بن ملک[10] حسام الدین۔

ملک حسام الدین، ملک علی اور ملک موجی تینوں بھائی تھے۔ موضع بھدوانی میں انکے مزارات آج بھی زیارت گاہ خلائق ہیں[1]۔ یہ تینوں بھائی قصبہ کول (علی گڑھ)

---

[1] مراۃ الاسرار

سے آکر موضع بھدوانی میں آباد ہوئے۔ یہ لوگ خواجہ ابوالقاسم و خواجہ بڈی کی اولاد سے ہیں جو چتوڑ میں شہید ہوئے۔ ان لوگوں کا تعلق حضرت خواجہ عماد خلجیؒ کی اولاد سے ہے۔ جو سید سالار مسعود غازیؒ کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور قصبہ کنتور میں شہید ہوئے۔ اس کے بعد ان کی اولاد نے قصبہ کول میں سکونت اختیار کر لی۔

موضع بھدوانی میں سکونت کا سبب

یہ حضرات ایک تقریب کے سلسلے میں قصبہ کول سے بہرائچ کے حدود میں آئے۔ ایک دن سیر کرتے اور شکار کھیلتے موضع بھدوانی پہونچے۔ ناگاہ ان کو ایک خرگوش دکھائی دیا۔ ان لوگوں نے اس پر شکاری کتے چھوڑ دیئے۔ تھوڑی دور تک تو بھاگ دوڑ رہی اس کے بعد ایک جگہ خرگوش مڑ کر کتوں پر حملہ آور ہوگیا۔ ان شکاریوں نے اپنی فراست سے اندازہ لگایا کہ اس مقام کی خاک مردم خیز اور جرأت آموز معلوم ہوتی ہے اس لیے یہاں وطن بنانا چاہیے۔ اس زمانہ میں یہاں بھر قوم کی آبادی و عملداری تھی۔ ان لوگوں نے مزاحمت کی اور جنگیں لڑیں۔ کافی لوگ شہید ہوئے۔ بالآخر ان ہی بزرگوں کی فتح ہوئی اور وہیں آباد ہوئے۔ اس موضع کے پورب جانب پاکر (پکریا) کے درخت کے قریب شہیدوں کی جو قبریں اور گنج شہیداں ہے وہ ان ہی شہداء کے مزارات ہیں۔

ملک حسام الدین اور ان کے اکثر ساتھی نیک اطوار متقی و پرہیزگار تھے۔ ملک اور خواجہ کا خطاب اس زمانہ کے دستور کے مطابق بادشاہ اپنے اچھے ارکان اور منتظمین کو دیتے تھے۔ ان بزرگوں میں بھی اچھی صلاحیتیں تھیں اسلیے ملک کہلائے۔

تعلیم و تربیت

شاہ نعیم اللہ کے والد زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن انسانی فضائل حیا و شرم، غیرت و محبت سے آراستہ تھے۔ باقی خاندان بھی علم کی وراثت سے مالا مال

تھا۔ ان کے چچا ملک بدیع الزماں بڑے ذہین اور عربی کی اچھی قابلیت رکھتے تھے اور فارسی میں قاضی محمد شفیع بہرائچی کے شاگردوں میں تھے۔ دادا نے مفتی محمد تابع لکھنوی سے علم حاصل کیا تھا۔ مخدوم احمدی و مخدوم شیخ پیارے کی اولاد میں خلیفہ حسن بہرائچی جو علوم ظاہری و باطنی میں پایہ کے بزرگ تھے ان کے اولاد پسری نہ تھی اس لیے انھوں نے اپنی لڑکی ان سے منسوب کر کے اپنا قائم مقام کیا اسی لیے یہ لوگ بہرائچ آکر سکونت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔

شاہ نعیم اللہ کی والدہ ماجدہ بھی سیدہ تھیں ان کا گھرانا بھی علم کی دولت سے مالا مال تھا۔ وہ نسباً مخدوم سید بڈھن سے تعلق رکھتی تھیں۔

مولانا نعیم اللہ کی شادی دختر قاضی عطاء اللہ بن شیخ بیچا بن شیخ بدلی بن احمد بن قاضی غلام مصطفٰے بن قاضی دانیال برادر قاضی جمال الدین عرف چندن کے ساتھ ہوئی اور ان کی وفات کے بعد دوسری شادی دختر سید ابو علی بن سید محمد رضا بن سید عنایت بن سید جعفر بن مظفر بن سید بدلی بن سید راجی کے ساتھ ہوئی۔ جن کا مکان شہر کا شغر محلہ تلادرہ میں تھا اور سادات بنی فاطمہ میں سے تھے مولانا نعیم اللہ کی پیدائش ۱۱۵۳ھ میں ہوئی اور بسم اللہ کی رسم سات سال کی عمر میں میانجیو شیخ محمد روشن بہرائچی کی خدمت میں ادا ہوئی۔ اس کے بعد ان کی پھوپھی نے ان کو اپنی فرزندی میں لے کر اپنے صاحبزادہ شیخ عطاء اللہ بن شیخ بیچا کے سپرد کیا لیکن جلد ہی ان کی وفات ہوگئی بقیہ تعلیم سرائے کے مدرسہ میں ہوئی۔ ایک سال کے عرصہ میں قرآن شریف ختم کیا۔ فارسی و عربی تعلیم کی طرف بھی توجہ رہی، انکے چچا مولوی بدیع الزماں صاحب کے ملفوظات ان کے طلب علم کے شوق کو بڑھاوا

دیتے رہے۔

۱۱۱۷ھ میں جبکہ شاہ نعیم اللہ کی عمر سولہ سال کی تھی وہ حاجی فتح علی کے ساتھ لکھنؤ گئے اور معالی خاں کی سرائے میں تکیہ شاہ ابراہیم بن حضرت شاہ معصوم میں میاں علی رضا صاحب کی خدمت میں پڑھنے لگے۔ جب وہ حج کو چلے گئے تو وقت کے مشہور فاضل مولوی محمد خلیل (شاہ بدر علی صاحب کے والد) کی خدمت میں صرف ونحو پڑھی۔ ان کے وصال کے بعد شاہجہاں پور میں مولوی امام بخش صاحب سے اور اس کے بعد بریلی میں مولوی شہاب الدین سے مسجد میرزائی میں تحصیل علم کی۔ کچھ عرصہ بعد دہلی کے مدرسہ دارانگر میں مولوی برکت علی الہ آبادی کے مدرسہ میں مولوی سالم علی سے اسباق شروع کیے۔ اسی دوران ان کے والد صاحب کا آدمی طلبی کا حکم لے کر پہونچا۔ اسی سے معلوم ہوا کہ والد صاحب میری تلاش میں مرادآباد تک آئے ہیں وہیں مجھے بلایا ہے۔ مجبوراً مرادآباد مکان ملک فیض اللہ پر ہوتا ہوا معہ والد صاحب کے وطن آیا اور چند سال قیام کیا۔ لیکن طلب علم کے شوق نے چین نہ لینے دیا اور تکمیل علم کی لگن لگی رہی۔ باوجود بار بار اجازت مانگنے کے کوئی بھی راضی نہ ہوا۔ آخر ۱۱۲۲ھ میں بغیر والدین سے رخصت ہوئے پوشیدہ طور سے لکھنؤ روانہ ہوگیا اور تکیہ شاہ محمد عاقل سبز پوش چشتی کاکوروی میں شاہ بدر علی کے یہاں قیام کر کے ملا نظام الدین لکھنوی کے شاگرد مولوی محمد ولی بن قاضی غلام مصطفیٰ بن ملا اسعد بن قطب الدین شہید سے کتب درسیہ کی تکمیل کی، علم فرائض و خلاصۃ الحساب مولوی مفتی عبدالرب لکھنوی سے پڑھا۔ کتب احادیث دہلی میں شیخ احمد شاگرد شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے، قرأت جزری وغیرہ قاری یوسف

ختلانی سے پڑھی۔ یہاں تک کہ ۱۱۸۶ھ میں خدا طلبی کی لگن پیدا ہوئی اور قسمت سے حضرت شاہ محمد جمیل قدس سرہٗ (خلیفہ اجل حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ) لکھنؤ تشریف لائے اور ان کے ارشاد کا شہرہ بلند ہوا۔ میں نے بھی ذوق وشوق میں حاضر ہوکر توجہ کی درخواست کی۔ بحمد اللہ ایک ہی توجہ میں دل ذاکر ہوگیا اور سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے جذب وشوق سے مالامال ہوگیا۔ ذکر قلبی وغیرہ میں نے ان ہی سے سیکھا اور انھیں کی رہنمائی میں حضرت میرزا مظہر جان جاناں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ چار ماہ قیام کیا۔ جب میرزا صاحب پانی پت جانے لگے تو مجھے بھی وطن جانے کا حکم دیا۔ وطن آکر دو ڈھائی سال قیام کیا۔ لیکن حضرت میرزا صاحب کے فراق نے بے چین کر دیا۔ آخر ۱۱۸۹ھ میں بغیر کسی کو اطلاع دیے دہلی روانہ ہوگیا۔ ۱۹ رمضان کو دہلی حاضر ہو کر مکمل چار سال دن ورات انکی خدمت میں حاضر رہ کر خرقہ اور اجازت طریقہ نقشبندیہ وقادریہ وچشتیہ وسہروردیہ سے مشرف ہوکر وطن آیا۔

اس چار سالہ قیام میں کامل یکسوئی کے ساتھ دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوکر تکمیل سلوک کی۔ یکسوئی کا یہ عالم تھا کہ اس چار سالہ قیام میں وطن سے جتنے خطوط آتے تھے سب کو بغیر پڑھے یکجا رکھتے جاتے تھے کہیں ان کے پڑھنے سے جمعیت خاطر میں فرق نہ آجائے۔ چار سال بعد پھر وطن سے طلبی ہوئی۔ میرزا صاحب نے گھر جانے کا حکم دیا اور چلتے وقت ازراہ توجہ وشفقت باطنی تاسف اور حسرت سے فرمایا کہ:

"یہ چار سالہ صحبت دوسروں کی بارہ سال کی محنت کے برابر ہے، انشاء اللہ

اس فیض سے ایک عالم منور ہوگا۔ تمھارا لکھنؤ کا قیام زیادہ بہتر ہوگا۔ شادی کے لیے فرمایا کہ اتباع سنت نبوی ہے۔ وہ بھی ظہور میں آئی۔ میرا قیام لکھنؤ میں رہا۔"

اس کے بعد ۱۲۰۵ھ ہجری میں پیر و مرشد کے مزار کی تعمیر کے سلسلے میں دہلی چلا گیا اور آج جبکہ ۱۲۰۸ھ ہجری ہے اور عمر کی چھپن[۵۶] منزلیں طے کر چکا ہوں۔ چار بار دہلی کا سفر کیا اور بارہا افغانوں کے ملک کی سیر کی اور دو[۲] بار پانی پت جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار مکمل چالیس[۴۰] روز حضرت مولوی ثناء اللہ پانی پتی کی خدمت میں بسر کیے۔ ان کی توجہ اور فیض صحبت سے ظاہری اور باطنی علوم کی تحقیقات و تدقیقات تازہ سے استفادہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایۂ فیض ہمارے سب کے سروں پر قائم رکھے انکا ایسا حضرت پیر و مرشد کے خلفا میں کوئی نہیں ہے۔

دہلی سے واپس آکر کچھ دنوں بہرائچ میں قیام کیا۔ اس کے بعد لکھنؤ چلے گئے۔[1] وہاں قندہاری بازار کے متصل بنگالی ٹولہ میں اقامت گزیں ہوئے۔ وہاں آپ نے مکان و مسجد بنوائی تھی۔ سلسلۂ رشد و ہدایت جاری کیا۔ یہ محلہ غدر کے بعد بالکل کھود ڈالا گیا۔ اب صرف مسجد باقی ہے۔ جو مراد علی لین واقع ایبٹ آباد برلنگٹن ہوٹل کے قریب واقع ہے۔

بہرائچ میں آپ کے ذریعہ علوم دین نے بڑا رواج پایا۔ اب تک آپ کے خاندان کی بڑی عزت اور احترام ہے۔ معمولات مظہریہ کے دیباچہ میں ہے کہ آپ باوجود ظاہری بے سروسامانی کے توکل بہت غالب تھا۔ اور طالبان خدا کو ذاکر و شاغل بنانے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ خطرۂ قلب پر بہت جلد متنبہ فرما کر اصلاح فرماتے۔

---

[1] معمولات مظہریہ ص۳۔

اکثر طالبوں نے شہرت حاصل کی۔ آپ کے خلفا میں بزرگ تر حضرت مولوی محمد احسن صاحب اٹک کے رہنے والے بہت مشہور ہوئے۔ ان کی ذات سے علاقہ بنگال میں سلسلۂ مجددیہ کی اشاعت بہت ہوئی اور مولوی مراد اللہ صاحب تھانیسری جنھوں نے اپنے پیر کی محبت میں بہرائچ میں قیام اختیار کیا۔ مزار آپ کا لکھنؤ میں ہے۔ مولانا شاہ بشارت اللہ صاحب آپ کے بھانجے اور داماد بھی بہت مشہور ہوئے۔ ان کی ذات سے بہرائچ کے قرب و جوار میں منہیات شرع سے لوگوں نے خوب دوری حاصل کی اور تائب ہو کر برائیوں سے الگ ہوئے۔

حضرت شاہ غلام علیؒ خلیفۂ حضرت مظہر جان جاناں دہلوی اپنی کتاب مقاماتِ مظہری میں ص۱۱۱ پر شاہ نعیم اللہ بہرائچی کے متعلق لکھتے ہیں:

"آپ کی صحبت میں دلوں کو جمعیت اور حضور حاصل ہوتا تھا۔ آپ کمال استقامت اور پیروی سنت نبویؐ میں نہایت کامل اور اخلاق حسنہ سے آراستہ تھے۔ گوشۂ صبر و قناعت کے ساتھ پانمالی میں وقت بسر کرتے۔"

"ظاہری و باطنی امراض کے علاج میں ممتاز تھے" (ص۱۰۱)

تاریخ آئینہ اودھ میں ہے کہ آپ مہمان نوازی میں بھی بے مثل تھے۔ (ص۱۳۵)

تصانیف میں آپ کی دو[۲] کتابیں بشارات مظہریہ اور معمولات مظہریہ بہت مشہور ہوئیں۔ معمولات مظہریہ تو متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔ بشارات مظہریہ کو آپ نے اپنے چار سالہ دہلی کے قیام میں تالیف کیا تھا۔ تکمیل کے بعد اس کو میرزا صاحب علیہ الرحمۃ کی خدمت میں پیش کیا۔ انھوں نے اس پر اصلاحیں بھی دیں۔ لیکن جب شاہ نعیم اللہ خرقۂ اجازت و خلافت حاصل کر کے (۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۹ء) اپنے وطن بہرائچ لوٹنے لگے تو

میرزا صاحب نے انہیں اس کی اشاعت سے منع کر دیا۔ عقیدت مند مرید نے
شایع تو نہیں کیا لیکن تبرک اور پاس ادب کی نیت سے اپنے پاس محفوظ رکھا
۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹-۹۰ء میں پھر اپنے احباب طریقت اور پیر بھائیوں کے اصرار پر باقی ماندہ
اجزا کو مرتب کر کے استخارہ مسنون کیا۔ کتاب کی تکمیل کی۔ کتاب کے مخطوطہ کے
آخر میں ۱۰ ارمحرم ۱۲۰۷ھ مطابق ۲۹ اگست ۱۷۹۳ء درج ہے۔ ایک عرصہ سے
اس کتاب کا مخطوطہ غائب تھا۔ اب معارف ۱۹۶۸ء میں عبدالرزاق قریشی مرحوم
(انجمن اسلام بمبئی) نے تفصیلی مقالہ لکھ کر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"اس کتاب سے میرزا صاحبؒ کی زندگی کے بعض ایسے حالات معلوم ہوتے ہیں
کہ جن کا ذکر کسی اور کتاب میں نہیں ہے۔"

"اس کا انداز بیان صاف اور سادہ ہے۔ کتاب سلسلۂ مظہریات
کی اہم کڑی ہے اور میرزا مظہرؒ کا کوئی سوانح نگار اسے نظرانداز
نہیں کر سکتا۔"

اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم لندن میں محفوظ ہے جس میں ۲۰۹ اوراق ہیں
ورق ۲۱۰ سے میرزا صاحب کے نامور مرید قاضی ثناء اللہ پانی پتی متوفی ۱۲۲۵ھ
کی ایک تصنیف السیف المسلول کے چند اوراق ہیں اس طرح اس کتاب کے کل
اوراق کی تعداد ۲۱۲ ہے۔ مخطوطہ کی کتابت ۱۰ محرم ۱۲۰۷ھ مطابق ۲۹ اگست
۱۷۹۲ء کی ہے۔ اس کتاب کے متن کا فوٹو حضرت مولانا ابوالحسن زید صاحب خانقاہ
ابوالخیر دہلی نے منگوایا ہے۔

دو مطبوعہ رسالے انفاس الابرار اور انوار الضمائر بھی مطبوعہ ہیں ان میں

خاندان نقشبندیہ مجددیہ کے خصوصیات ہیں عرصہ ہوا نولکشور پریس نے مجموعہ کے طریقہ
پر چھاپے تھے اب نایاب ہیں۔

غیر مطبوعہ تصانیف میں۔ میر زاہد اور ملا جلال پر آپ کا حاشیہ موجود ہے۔
ایک خود نوشت سوانح عمری۔ ایک مثنوی اپنے پیر کے حالات میں ہے جو تقریباً
ایک جز کی ہے، خانقاہ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ آپ نے بڑا اچھا کتب خانہ
جمع کیا تھا جو زمانہ کے ہاتھوں برباد ہوا۔

آپ کے دو عقد ہوئے۔ جس سے صرف ایک صاحبزادی یادگار رہیں۔ جن کا
عقد آپ کے حقیقی بھانجے شاہ بشارت اللہ کے ساتھ ہوا۔ جن سے شاہ ابوالحسن پیدا ہوئے۔
وصال آپ کا ۵ صفر ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء یوم جمعہ نماز عصر کے سجدہ میں ہوا۔ مزار مبارک
مولوی باغ گورنمنٹ کالج کے سامنے عین لب سڑک ہے بابرکت جگہ ہے۔ معمولات
مظہریہ میں ذیل کا قطعہ تاریخ وفات درج ہے۔

مولوی صاحب نعیم اللہ در وقت نماز — بہر سجدہ سر نہادہ کرد رحلت زین جہان
سال تاریخش چو از نور باد دل غمگین بجست — ہاتفے گفتا ز سر شد سوئے حق راہ روان
۱۲۱۸ھ

اخبار علمیہ

ماریشس، بحر ہند کا خوبصورت جزیرہ ہے، اس کے سرسبز درختوں، خوشنما پھولوں، سرخ زمین اور صاف و شفاف ساحلوں کی مانند اس کے باشندوں کی تہذیب اور زبان میں بھی بڑی رنگارنگی ہے، بحری جائے وقوع کی اہمیت کی وجہ سے یہ عرب، ڈچ، فرانسیسی اور انگریز حوصلہ مندوں کی آماجگاہ رہا، ہندوستانی یہاں مزدور اور تاجر کی حیثیت سے آئے اور اب غالب تعداد انہی کی ہے، ایک ملین کی آبادی میں ۵۱٪ ہندو اور ۱۷٪ مسلمان ہیں مقامی کرے اول (CREOLE) ۲۵٪ چینی ۳٪ اور فرنکو ماریشین ایک فیصد ہیں، مسلمانوں میں زیادہ تعداد بہاری مسلمانوں کی ہے جن کو کلکتیا بھی کہا جاتا ہے، کچھ تجارت پیشہ مسلمانوں کا تعلق سورت اور کچھ سے ہے، رنگ و نسل کے فرق کی طرح ان کی زبانیں بھی متعدد ہیں۔ مقامی کرے اول کے علاوہ ہندی، اردو، فرانسیسی اور انگریزی زبانیں رائج ہیں، ریڈیو اور ٹی وی کی نشریات تقریباً ایک درجن زبانوں میں ہوتی ہیں اور تیس سے زیادہ اخبارات و رسائل شایع ہوتے ہیں، شرح خواندگی ۹۰٪ ہے، پرائمری اسکولوں میں ۸۰٪ سے زیادہ طلبہ ہندی پڑھتے ہیں، چار سو مکاتب میں اردو اور عربی کی تعلیم دی جاتی ہے، دسمبر میں یہاں عالمی اردو کانفرنس ہوئی، اس سے پہلے ہندی، تامل، تیلگو اور مراٹھی کی کانفرنسیں بھی ہو چکی ہیں، اردو کانفرنس میں ہندو پاکستان کے علاوہ جنوبی افریقہ، سعودی عرب، روس، فرانس اور کناڈا وغیرہ کے نمائندے بھی شریک ہوئے،

رسالہ 'نیشن اینڈ دی ورلڈ' کے مدیر جناب سید حامد نے کانفرنس کی مفصل اور پر از معلومات روداد تحریر کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستانی وفد بیس ارکان پر مشتمل تھا، افتتاح کے موقع پر ماریشس کے گورنر جنرل سر ویرا سامی رنگاڈو اور وزیر اعظم شری انرود جگناتھ کے علاوہ وزراء و عمائد کی بڑی تعداد موجود تھی، کانفرنس کے آٹھ سیشن ہوئے، ان میں اردو کے سماجی و تہذیبی پس منظر موجودہ اردو ادب' اردو اور فنون لطیفہ اور عالمی سطح پر مطالعات اردو اور دوسرے مسائل زیر بحث آئے، اقوام متحدہ کی زبانوں میں اردو کو شامل کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور پانچ علمی مرکزوں کناڈا، ماریشس، سعودی عرب، پاکستان اور ہندوستان پر مشتمل ایک وسیع نٹ ورک کی تجویز بھی منظور ہوئی۔

گذشتہ ماہ نومبر میں اندلس کے شہر قرطبہ میں علامہ اقبال کی یاد میں ایک بین الاقوامی اجتماع ہوا، اس کی دلچسپ روداد پاکستان کے پروفیسر رفیع الدین ہاشمی کے قلم سے ہفت روزہ ایشیا، لاہور میں شایع ہو رہی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ 'اسلام اور مغرب' نامی تنظیم کے صدر اور قرطبہ کے ایک ثقافتی مرکز کے ڈائریکٹر پروفیسر ڈاکٹر فرانسس لامان نے اسلام اور مغرب کو باہم قریب ہونے اور سمجھنے کی غرض سے اس کانگریس کے انعقاد میں سرگرم حصہ لیا، ۳۲ ملکوں کے نمائندوں میں مصر، ترکی، مراکش، تیونس، اٹلی، روس، تاجکستان، ایران، جاپان، جرمنی اور برطانیہ وغیرہ کے ممتاز اقبال شناس بھی شامل تھے، پاکستان کے وفد میں ڈاکٹر جاوید اقبال، پروفیسر منور مرزا وغیرہ بھی شامل تھے، یہ سب سے بڑا وفد تھا، ہندوستان سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور سید مظفر حسین برنی شریک ہوئے، عام طور سے علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ پر بحث کی گئی، مقالات جلد ہی کتابی شکل میں طبع ہونگے۔

عالمی ادارہ صحت نے 'سب کے لیے نباتات اور صحت' کے موضوع پر مسلسل اجتماعات کا

ایک منصوبہ بنایا ہے، اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مختلف علاقوں کا طبی معیار بلند کیا جائے، گذشتہ سال کے وسط میں جاپان کے شہر کوبے میں اس سلسلہ کے پہلے اجتماع میں پاکستان کے جناب حکیم محمد سعید نے ایک مشیر کی حیثیت سے شرکت کی، انجمن ترقی طب پاکستان کے ترجمان 'اخبار الطب' نے اس کانفرنس کی تفصیل اور حکیم صاحب کا پُر مغز مقالہ شایع کیا ہے اس میں طب اسلامی کی تاریخ 'ابن طبری، ابن سینا اور زکریا رازی کے طبی امتیازات کے علاوہ بابچی' مازو' بن ککڑی، اسرول، اسطوخودوس، اڑوسہ اور آملہ وغیرہ جیسے نباتات کی اہمیت وافادیت کا بھی ذکر ہے، طب اسلامی کے نظریات پر بحث کرتے ہوئے لکھا گیا ہے اس نظام طب میں متعدد مشرقی اقوام کے افکار و تجربات اور تاریخی و معاشرتی ورثہ کی آمیزش نے جو خوبصورت امتزاج بخشا ہے وہ اور کسی نظام طب میں نظر نہیں آتا، عالمی ادارہ صحت کے زیر سایہ' سرزمین جاپان پر طب جدید کے تفوق و برتری کے شور میں طب اسلامی کے جسم ناتواں کو شادابی اور تر و تازگی بخشنا حکیم صاحب کی مسیحائی کا ثبوت ہے

―――― . ――――

یورپ کی شرق نوازی اور علوم اسلامیہ سے خصوصی اعتنا ر کے اسباب جو بھی ہوں، اس کی کاوشوں کی محنت و جدت بہر حال داد کے لائق ہے۔ ہمبرگ یونیورسٹی کا شعبہ مطالعات شرق ایک فعال ادارہ ہے، یہ ۱۹۸۴ء میں قائم ہوا تھا، اس میں ترکی، ایرانی، عربی اور اسلامی مطالعات کے علاوہ اسلامی فنون لطیفہ اور آثار قدیمہ کے لیے بھی ایک شعبہ مخصوص کیا گیا ہے، حال ہی میں ان کے لیے ایک کمپیوٹری فہرست کتابیات مرتب کی گئی ہے اور پیرس۔ سربون یونیورسٹی کے مرکز تاریخ برائے اسلامی فنون لطیفہ و آثار قدیمہ کے تعاون سے

ایک وسیع دستاویزی نمایش کا منصوبہ بھی بنایا گیا ہے، تاکہ عالم اسلام کا ایک مصور آ کائیو' مشرق، مغرب' کے نام سے تیار کیا جائے جس میں قدیم وجدید کتابوں، ذاتی ذخیروں اور دوسرے ذرایع کی مدد سے عمارتوں کی تصویریں، دستکاری کے مرقعے وغیرہ شامل ہوں، اس شعبہ نے حال ہی میں بلند پایہ علمی و تحقیقی مضامین پر مشتمل جرمن زبان میں ایک مجلہ بھی شایع کیا ہے۔

―――― . ――――

یورپ میں اگر ایک طرف علم و ہنر کا غلغلہ ہے تو دوسری طرف یہ افسوسناک خبر بھی ہے کہ لندن کی رائل کامن ویلتھ سوسائٹی نے مالی مشکلات کی وجہ سے اپنی ۱۲۰ سالہ قدیم و مشہور لائبریری کو بند کرنے اور اس کی کتابوں کو نیلام کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ برطانیہ میں اسے 'لائبریری کلچر' کے ناقابل تلافی نقصان سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اس کتب خانہ میں ۵ لاکھ سے زیادہ تاریخی، نایاب اور بیش قیمت کتابوں، مخطوطات' نہارس اور رسائل کے ذخیرہ کے علاوہ تقریباً ستر ہزار نہایت قیمتی تصاویر کا خزانہ بھی ہے، بعض فوٹوگراف ۱۸۵۰ء سے پہلے کے ہیں، تشویشناک بات یہ ہے کہ نیلام کے بعد یہ قیمتی ذخیرہ بکھر کر طلبہ اور محققین کی دسترس سے دور ہو جائے گا۔ مسٹر ڈبلو جے ویسٹ کی تازہ تصنیف (THESTRANGERISE OF SEMI LITERATE ENGLAND: THE DISSOLUTION OF LIBRARIES) نے علمی حلقوں میں ہلچل مچا رکھی ہے، انھوں نے اس کتبخانہ کے ضیاع کو بدترین حادثہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ صرف بیس برس پہلے تک اس کا کوئی تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

―――― . ――――

ع۔ص۔

معارف کی ڈاک

نابھا سے ایک خط

۲۱-۱-۹۲ - محلہ دیوان - نابھا - پنجاب

مکرم - معظم - محترم - آداب -

" ادب ادب ہے ادب کا نہیں کوئی مذہب - خدا کے فضل سے یہ کفر ہے نہ یہ اسلام" میں نے دوردرشن سے منسٹر انفارمیشن کا اعلان سنا کہ انھوں نے ۲۵ لاکھ روپیہ اردو والوں کو دیا ہے - یہ اردو والے کون ہیں - یہ انھوں نے نہیں بتایا -

آپ نے پچھلے دنوں ڈپٹی انفارمیشن کی ایک کتاب اردو میں ریلیز ہوئی دیکھی ہوگی اردو کی ہر تقریب میں وہ موجود ہوتی ہیں - ان سے کوئی فائدہ حاصل کرنا مشکل نہیں - سوال یہ ہے کہ کیا یہ روپیہ اردو کی بقا کے لیے خرچ ہوگا - یا مشاعروں پر ضایع ہوگا - حضرت اتنے روپوں میں کتنے اردو کے سکول قائم ہوسکتے ہیں کیتی ایسی کتابیں جو نہایت مفید ہیں - اردو اور فارسی کی چھپ سکتی ہیں، " فارسی کے ہندو انشا پرداز" لکھنے کا میرا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جانیں کہ ہندو فارسی داں تھے -

اب آپ " پنجاب میں عربی" پڑھیں گے - نئی باتیں دوں گا - عربی میں بھی پنجاب پیچھے نہیں تھا - چھپنے کی فکر نہیں - ہر ماہ میرے مضامین چھپنے بھی نہیں چاہئیں -

نیازمند

لام لعل نابھوی

ادبیات

غزل

از

حضرت عروج زیدی (مرحوم)

" عطائے اذیت" خوشی آپ کی ستم ہے ستم، دوستی آپ کی
مری بزم ہے واقعی آپ کی کمی ہے تو شاید کمی آپ کی
نہیں اس میں موجوں کی ہلچل نہیں طرب کار ہے زندگی آپ کی
وہاں تک شکایت ہیں کیوں جائیے جہاں سے نہ ہو واپسی آپ کی
مری بے خودی خودنما بن گئی تماشا نگر ہے گلی آپ کی
جہاں سنگ باری بہ ہر گام ہے وہاں بھی ہے شیشہ گری آپ کی

نہ کیوں معتبر ہو کلام عروج
قلم کا سفر، رہبری آپ کی[1]

---

[1] الشعراء تلامیذ الرحمٰن -

مطبوعات جدیدہ

فرہنگ زفان گویا جلد اول (فارسی) تالیف بدر ابراہیم، تصحیح و ترتیب از جناب پروفیسر نذیر احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، بہترین کتابت و طباعت، صفحات ۵۵۲ قیمت ۵۰ روپیے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

زفان گویا و جہان پویا ایک قدیم فارسی فرہنگ ہے۔ جس کو نویں صدی ہجری کے اوائل کی تالیف بتایا جاتا ہے، اس کے مولف بدر ابراہیم کا تعلق شیراز ہند جونپور کے ایک ایسے علمی خاندان سے تھا جو فارسی فرہنگ نگاری کے لیے مشہور ہے چنانچہ شرف نامہ مولفہ ابراہیم قوام بھی اسی خاندان کی علمی یادگار ہے، زیر نظر فرہنگ کے مخطوطہ کا علم پہلے خدا بخش لائبریری کے ذخیرہ سے ہوا، بعد میں تاشقند یونیورسٹی کے کتبخانہ میں بھی اس کے ایک اور قلمی نسخہ کا سراغ ملا۔ اب پروفیسر نذیر احمد نے ان دونوں نسخوں کی مدد سے اس کا متن مرتب کرکے تصحیح و تعلیق اور تحشیہ کے بعد شایع کیا ہے، فاضل مرتب نے اپنے عالمانہ مقدمہ میں زفان گویا کے اصل نام اس کے مولف اور اس کے خاندان، تاریخ تالیف اور فرہنگ کے ماخذ و مندرجات کے بارہ میں مفید اور ضروری معلومات بھی جمع کردیے ہیں، اسی ضمن میں بعض دوسرے محققین حافظ شیرانی وغیرہ کی چند غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا ہے، اور فرہنگ کی خوبیاں دکھانے کے ساتھ اس کے نقائص کی نشاندہی بھی کی ہے، فارسی لفظوں کی تشریح میں مولف نے سینکڑوں ایسے ہندوستانی الفاظ بھی نقل کیے تھے جو خاص طور پر دیار پورب میں بولے جاتے تھے وہ اب بھی رائج ہیں، فاضل مرتب نے ان سب لفظوں کی نشاندہی کرکے

مولف کے جونپوری ہونے کی ایک بڑی داخلی شہادت فراہم کردی ہے، آخر میں الفاظ و اسماء و اماکن کا اشاریہ بھی درج ہے، مقدمہ فارسی کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی ہے اس بیش قیمت مخطوطہ کی اشاعت پر خدا بخش اورینٹل لائبریری مبارکباد کی مستحق ہے۔

معیار از جناب قاضی عبدالودود، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۰۰، قیمت ۵۰ روپیے، ناشر: خدابخش لائبریری پٹنہ، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی اردو شاخ پٹنہ کی جانب سے جناب قاضی عبدالودود نے ایک تحقیقی و ادبی رسالہ معیار اس مقصد سے نکالا تھا کہ وہ ادب میں اجتہادی شان کا حامل ہو اور کسی طرز خاص کا پابند نہ ہو، افسوس کہ معیار نے حیات مستعار کم پائی اور صرف چھ اشاعتوں کے بعد وہ بند ہوگیا، لیکن اس مختصر عرصہ میں بھی اس نے اپنے بلند پایہ اور متنوع ادبی و تحقیقی مضامین کی وجہ سے اصحاب علم اور اہل نظر سے خراج تحسین حاصل کرلیا تھا، معیار کا بڑا حصہ خود قاضی صاحب کی تحریروں سے مزین ہوتا تھا، مقالات کے علاوہ معروضات، تعارف، مطبوعات جدیدہ، اخبار ادب، استفسارات وغیرہ مختلف عنوانوں کے تحت ان کی جو تحریریں رسالہ میں درج ہوتی تھیں ان سے ان کے بلند درجہ و معیار کا اندازہ ہوتا ہے، معروضات کے ذیل میں اردو زبان کے متعلق انھوں نے جو اظہار خیال کیا ہے وہ اب بھی معنویت سے خالی نہیں ہے اور ادب کے طالب علموں کے مطالعہ کے لائق ہے مئی سنہ ۳۶ء کا ایک اداریہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس میں گاندھی جی کی لسانی پالیسی سے متعلق مستقبل میں یہ شبہات ظاہر کیے گئے تھے کہ" گاندھی جی کے راج میں اردو بولنے والوں کے لیے مزید سہولتوں کا حاصل ہونا تو درکنار، اسکی وہ حیثیت

باقی نہ رہے گی جو آج ہے، ہندی کو ملک کی زبان قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اردو دفتروں اور عدالتوں سے خارج کی جائے گی...“ ان کا یہ طنزیہ فقرہ آج بھی پرلطف ہے ”کیا آپ ایسے شخص کو قائل کر سکتے ہیں جو عالم بالا سے براہ راست تعلقات رکھتا ہے اور جس کا ہر قول و فعل دیوتاؤں کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے؟“ رسالہ معیار کے تمام شماروں کو از سر نو یکجا کرکے اور عکسی صورت میں شایع کرکے ادارہ خدا بخش لائبریری نے قابل تحسین خدمت انجام دی ہے، جناب عابد رضا بیدار کا مقدمہ دلچسپ اور قاضی صاحب کے طرز نگارش کا عمدہ جائزہ ہے۔ آخر میں ایک تجزیاتی اشاریہ اور معیار کے اور مضمون نگاروں کا تعارف بھی دیا گیا ہے۔

قافلہ اہل دل

مرتبہ از جناب مولانا نسیم احمد فریدی مرحوم، متوسط تقطیع کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۰۲، قیمت ۲۵ روپیے پتہ: الفرقان بک ڈپو، نظیر آباد، ۳۱ نیا گاؤں مغربی لکھنؤ۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کے خلیفہ اجل اور مجددیہ رموز و معارف کے وارث شاہ عبداللہ غلام علیؒ دہلوی نقشبندی کی ذات بابرکات سے ہندوستان میں اصلاح نفوس اور تزکیہ باطن کا غیر معمولی کام انجام پایا، ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں سے بھی تشنگان رشد و ہدایت ان کی جانب کھنچے چلے آتے تھے، ان کے متعلق مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادیؒ کا یہ قول مشہور ہے کہ ’عشق کی دو دو کانیں دیکھیں ایک تو شاہ غلام علی صاحب اور دوسری شاہ آفاق کی کہ ان دوکانوں میں عشق کا سودا بکا کرتا تھا، شاہ غلام علیؒ کے ایک ممتاز مسترشد اور خلیفہ شاہ رؤف احمد رافتؒ مجددی رامپوری نے درالمعارف کے نام سے اپنے مرشد کے بعض ملفوظات و مکتوبات جمع کیے تھے۔

جو فارسی زبان میں تھے عرصہ ہوا مولانا نسیم احمد فریدی مرحوم نے ان کا اردو ترجمہ کرکے ماہنامہ الفرقان لکھنؤ میں بالاقساط شایع کیا تھا جو اب کتابی صورت میں طبع ہوا ہے، مولانا فریدی مرحوم خود صاحب دل بزرگ تھے، اس لیے رشد و ہدایت کے ان انمول مضامین کے ترجمہ میں بھی لطف و لذت اور سرور و سرمستی کی پوری کیفیت موجود ہے جس کا اندازہ مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، فاضل مترجم نے شاہ صاحب کے چند نامور خلفاء شاہ ابوسعید مجددی، ملا خدا بردی ترکستانی، شاہ سعد اللہ، شاہ رؤف احمد، مولانا بشارت اللہ بہرائچی، مولانا خالد شہرزوری کردی اور مولانا اخوند جان فخر ہزاروی وغیرہ کے مختصر حالات بھی دے دیے ہیں۔

تذکرہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ و شاہ ابوالرضا دہلویؒ

مرتبہ از مولانا نسیم احمد فریدی مرحوم مع ضمیمہ ’اہل قبور کی زندوں سے ہم کلامی‘ از جناب مولانا محمد منظور نعمانی، چھوٹی تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۷۲، قیمت ۱۴ روپیے، پتہ: الفرقان بکڈپو نظیر آباد (۳۱ نیا گاؤں مغربی)، لکھنؤ۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی یگانۂ روزگار اور نابغہ عصر شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ان کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم فاروقی اور عم بزرگوار شاہ ابوالرضا دہلوی کا بڑا دخل تھا، یہ دونوں بزرگ علم و عمل، اتباع شریعت، صلاح و تقویٰ اور توکل و استغنا میں سلف صالحین کا نمونہ تھے، ان دونوں کے حالات و سوانح جستہ جستہ انفاس العارفین نزہتہ الخواطر، حیات ولی، مزارات اولیائے دہلی، انفاس رحیمیہ اور ارشاد رحیمیہ میں موجود تھے، مولانا نسیم احمد مرحوم نے مذکورہ بالا کتب کی مدد سے ان حضرات کے حالات اور مکتوبات و ملفوظات کے بکھرے ہوئے موتیوں کو سلیقہ سے ایک لڑی میں

پرو دیا ہے، یہ مجموعہ مطالعہ کے لائق ہے، شاہ عبدالرحیم کی نسبت سے اہل قبور سے ہمکلامی کے بعض واقعات ملتے ہیں، ان کے تعلق سے پیدا ہونے والے شبہات کے شافی و کافی جواب کیلئے مولانا منظور نعمانی نے ایک عمدہ تحریر سپرد قلم کی تھی جس کو ضمیمہ کے طور پر اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے جس سے اس کی قدر و قیمت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

ایثار آخرت مترجم جناب مولانا عبدالجبار مئوی، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر، صفحات ۳۲۲، قیمت درج نہیں، پتہ: المجمع العلمی، پوسٹ بکس ۱۸ مئوناتھ بھنجن ۲۷۵۱۰۱۔

کئی برس پہلے امام عبداللہ بن مبارکؒ کی کتاب الزہد والرقائق کو محدث شہیر جناب مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اپنے فاضلانہ حواشی و تعلیقات اور مفید مقدمہ کے ساتھ مرتب کرکے شایع کیا تھا، مولانا عبدالجبار مئوی نے اس گنج گراں مایہ کا اردو ترجمہ کیا ہے، اصل کتاب میں امام مروزی اور نعیم بن حماد کی روایات ہیں، مگر زیر نظر ترجمہ میں صرف امام مروزی کی روایات ہی آسکی ہیں اور بعض جگہ ٹھیٹ اور لفظی ترجمہ کی وجہ سے روانی میں فرق آگیا ہے، مثلاً "نبیؐ کی ہنسی صرف مسکراہٹ ہوتی اور کسی سے مسکراہٹ کے وقت نہ منھ پھیرتے مگر دونوں ساتھ ہی" "حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی قمیص میں نے پہنی تو میں لگی دیکھنے اس کی طرف" اسی طرح زبان میں بھی کئی جگہ ناہمواری ہے، مثلاً "جب دونوں لشکر لڑتا ہے" "خدا کی خوشنودی چاہنے کو لڑتا ہے" "آپ شعر نہیں بناتے ہیں" "تمھاری نفس ہمیشہ جوان رہتی ہے" بعض جگہ مفہوم واضح نہیں ہے جیسے "میں نے اپنے جیسے نہیں دیکھا، جماعتیں جماعتوں تک نہیں چلیں، روتی ہیں" ایک جگہ آیت کُلُوا مِنَ الطَّیِّبَاتِ کی جگہ مِن طَیِّبَاتِ لکھ دیا گیا ہے، خود کتاب کے نام ایثار آخرت کی ترکیب نامانوس ہے۔

ع۔ص۔

سلسلۂ سیر الصحابہؓ

حصۂ اول (خلفائے راشدین) حاجی معین الدین ندوی: اس میں خلفائے راشدین کے ذاتی حالات و فضائل، مذہبی اور سیاسی کارناموں اور فتوحات کا بیان ہے۔ ۴۰/-

حصۂ دوم (مہاجرین۔ اول) حاجی معین الدین ندوی: اس میں حضرات عشرۂ مبشرہ، اکابر بنی ہاشم و قریش اور فتح مکہ سے پہلے اسلام لانے والے صحابۂ کرامؓ کے حالات اور ان کے فضائل کا بیان ہے۔ ۴۵/-

حصۂ سوم (مہاجرین دوم) شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں بقیہ مہاجرین کرامؓ کے حالات و فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

حصۂ چہارم (سیر الانصار اول) سعید انصاری: اس میں انصار کرام کی مستند سوانح عمریاں، ان کے فضائل و کمالات مستند ذرائع بہ ترتیب حروف تہجی لکھے گئے ہیں۔ ۴۵/-

حصۂ پنجم (سیر الانصار دوم) سعید انصاری: اس میں بقیہ انصار کرام کے حالات و فضائل درج ہیں۔ ۳۵/-

حصۂ ششم شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں چار اہم صحابۂ کرامؓ، حضرات حسنینؓ، امیر معاویہؓ اور حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے حالات، ان کے مجاہدات اور باہمی سیاسی اختلافات بشمول واقعۂ کربلا درج ہیں۔ ۳۵/-

حصۂ ہفتم (اصاغر صحابہؓ) شاہ معین الدین احمد ندوی: اس میں ان صحابۂ کرام کا ذکر ہے، جو فتح مکہ کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے یا اس سے پہلے اسلام لا چکے تھے مگر شرف ہجرت سے محروم رہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں کمسن تھے۔ ۴۰/-

حصۂ ہشتم (سیر الصحابیاتؓ) سعید انصاری: اس میں آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات و بنات طاہرات اور عام صحابیات کی سوانح حیات اور ان کے علمی اور اخلاقی کارنامے درج ہیں۔ ۲۵/-

حصۂ نہم (اسوۂ صحابۂ اول) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابۂ کرامؓ کے عقائد، عبادات، اخلاق اور معاشرت کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے۔ ۴۰/-

حصۂ دہم (اسوۂ صحابۂ دوم) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابۂ کرامؓ کے سیاسی، انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل دی گئی ہے۔ ۴۵/-

حصۂ یازدہم (اسوۂ صحابیاتؓ) عبدالسلام ندوی: اس میں صحابیات کے مذہبی، اخلاقی اور علمی کارناموں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ ۱۵/-